اہل حق کی نصرت و تائید اور اہل باطل کی تردید میں اٹھایا جانے والا قلم سب سے بہترین قلم ہے۔

(امام ابن قیم رحمہ اللہ۔ التبیان في أیمان القرآن: ص: ۳۱۰)

شمارہ نمبر ۹

جلد: ۲- شمارہ نمبر: ۹- ربیع الاول: ۱۴۴۶ھ، ستمبر: ۲۰۲۴ء

اس شمارے میں:

- ڈاکٹر زبیر صاحب کا علمی مذاکرہ بنام "حجیت منہج سلف" کا جائزہ (قسط اول)
- عقائد کے باب میں منہج سلف کی وسطیت
- ابو بکر صدیق : فضیلت، خلافت اور روافض کے بعض شبہات (قسط چہارم)
- دعوتی امور میں اہل بدعت کے ساتھ شراکت اور منہج موازنات کا جائزہ (قسط دوم)
- لفظ "منہج" پر اعتراض اور اس کے جوابات (قسط سوم)

اہل حق کی نصرت و تائید اور اہل باطل کی تردید میں اٹھایا جانے والا قلم سب سے بہترین قلم ہے۔

جلد: ۲- شمارہ نمبر: ۹- ربیع الاول: ۱۴۴۶ھ، ستمبر: ۲۰۲۴ء

زیر اشراف: فاروق عبد اللہ نراین پوری
ابو احمد کلیم الدین یوسف

مدیر: حافظ علیم الدین یوسف

نائبان: عبد اللہ عبد الرشید مدنی
حافظ فیضان عالم

معاونین: محمد آصف سلفی
حافظ آفتاب عالم
کامران اشرف سلفی

منہج سلف کے نام سے نشر ہونے والا یہ ایک برقی مجلہ ہے جس کا مقصد خالص سلفی دعوت کی نشر و اشاعت اور منحرفانہ وملحدانہ افکار کی بیخ کنی ہے۔

مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ

"جماعت اہل حدیث نے مسلک کی تبلیغ میں ہمیشہ تساہل برتا، ہم اور ہمارے مبلغ اپنے مواعظ وتقاریر میں صلح کل پالیسی اختیار فرماتے رہے، تلخی، تیزی، بد زبانی یقیناً بری چیز ہے لیکن اچھے لفظوں میں حقیقت کی وضاحت میں تساہل کرنا عیب ہے۔ قادیانی، ومنکرین حدیث اپنے خیالات کے اظہار میں جھجھک محسوس نہیں کرتے لیکن ہم لوگ ہمیشہ صلح پسندی میں حقیقت پسندی سے گریز کر جاتے ہیں، اب تو کچھ ایسے حضرات پیدا ہوگئے ہیں جو کہ اہل حدیث کے ذکر سے شرماتے ہیں"۔ (مقدمہ حسن البیان: ص: ۱۹)

فہرست عناوین

اداریہ		۳
ڈاکٹر زبیر صاحب کا علمی مذاکرہ بنام "حجیت منہج سلف" کا جائزہ (قسط اول)	حافظ علیم الدین یوسف	۵
عقائد کے باب میں منہج سلف کی وسطیت	مامون رشید بن ہارون رشید سلفی	۱۳
ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ: فضیلت، خلافت اور روافض کے بعض شبہات (قسط چہارم)	حافظ علیم الدین یوسف	۳۵
دعوتی امور میں اہل بدعت کے ساتھ شراکت اور منہج موازنات کا جائزہ (قسط دوم)	ابو المدیح بلال الخلیلی	۴۱
لفظ "منہج" پر اعتراض اور اس کے جوابات (قسط سوم)	عبد العزیز یوسف	۴۷

اداریہ

شریعت اسلامیہ میں علما کا بڑا بلند مقام ہے۔ یہ انبیا کے وارث ہیں، یہ دین کے محافظ ہیں، تبلیغ دین کا جو کام انبیا کی جماعت کے سپرد کیا گیا تھا اب نبوت کا دروازہ بند ہونے کے بعد اس مشن کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری بھی ان علماے کرام کے ہی کاندھوں پر ہے۔ روئے زمین کی تمام چیزیں ان کے حق میں دعائیں کرتی رہتی ہیں۔

علماے کرام کی توقیر اللہ رب العالمین کی توقیر میں داخل ہے (۱) جبکہ ان کی حقوق تلفی اور ان کی اہانت کبیرہ گناہوں میں سے ہے (۲)۔

علما سے تنفر اور ان پر عدم اعتماد کا فتنہ نہایت قدیم ہے، چنانچہ ذوالخویصرا التمیمی نے انبیا اور علما کے سردار محمد ﷺ پر انگلی اٹھائی تھی اور غیر عادل اور غیر منصف گردانا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اسی وقت پیشن گوئی فرمادی تھی کہ اس کی نسل سے ایک ایسی جماعت نکلے گی جو بظاہر بہت دین دار ہوگی لیکن حقیقت میں دین سے دور ہوگی۔ عہد صحابہ میں اس جماعت کا ظہور ہوا۔ انہوں نے ذوالخویصر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے صحابہ کرام جیسی عظیم جماعت پر زبان طعن دراز کیا اور ان کی ثقاہت وعدالت پر انگلی اٹھائی۔ اس کے بعد یہ ریت قائم ہوگئی۔ چنانچہ جس شخص کو اپنی بدعات کو رواج دینا ہوتا وہ سب سے پہلے علماے حق کے خلاف ہرزہ سرائی کرتا، ان کے خلاف کذب بیانی کرکے عوام کو ورغلاتا پھر جب لوگ اس کے دام فریب میں آجاتے تو اپنی بدعات کا پرچار کرتا۔ کیوں کہ علما ہی ہیں جو ہر زمانے میں بدعات کے خلاف بر سر پیکار رہے، داخلی اور خارجی تمام فتنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ نہ کتاب وسنت کے نصوص میں کسی قسم کی تحریف ہونے دیا اور نہ نصوص کے معانی ومفہوم میں کسی قسم کی تبدیلی پر خاموش رہے۔ نبی اکرم ﷺ م ءایک ایسی جماعت کے وجود کی گواہی اپنے زمانے میں ہی دے دی تھی، فرمایا: «يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُولُهُ يَنْفُونَ عَنْهُ تَحْرِيفَ الْغَالِينَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِينَ وَتَأْوِيلَ الْجَاهِلِينَ». (۳) "(کتاب وسنت) کے اس علم کو ہر زمانے کے صالح علما کی جماعت سے ان کے بعد آنے والے ثقہ لوگ

---

(۱) سنن أبی داود ت الأرنؤوط: (۴۸۴۳)۔

(۲) مسند أحمد: (۲۲۷۵۵)۔

(۳) السنن الکبری للبیہقی: (۲۰۹۱۱)۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو مشکاۃ المصابیح (۸۲/۱) حدیث نمبر: (۲۴۸) میں صحیح قرار دیا ہے۔

حاصل کریں گے۔ وہ اس ولم کو غلو کرنے والوں کے غلو سے پاک کریں گے نیز جھوٹے لوگوں کے جھوٹ کا پردہ چاک کریں گے اور جہلا کی باطل تاویلات کا رد کریں گے"۔

ہمارے اس زمانے میں بھی بعض ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے علماے سلف کے خلاف ہرزہ سرائی اپنی زندگی کا مقصد بنالیا ہے۔ اپنے ناقص علم اور کج فہمی کی بنا پر کبھی امام بربہاری، کبھی امام اللالکائی اور کبھی امام حسن بصری رحمہ اللہ کو تکفیری باور کرانے کی سعی مذموم کی ہے۔ عصر حاضر کے معروف سلفی علما کے خلاف طعن و تشنیع کا بازار گرم کیا اور اہل بدعت کے پیشواؤں کا ناحق دفاع کیا۔

ان جیسے فتنوں کی کی سرکوبی اور منہج سلف کی حقانیت کو دلائل کے ساتھ بیان کرنے کے لئے ہی مجلہ منہج سلف کا اجرا عمل میں آیا ہے۔ اللہ ہمیں منہج سلف پر قائم ودائم رکھے۔ آمین۔

حافظ علیم الدین یوسف
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

ڈاکٹر زبیر صاحب کا علمی مذاکرہ بنام "حجیت منہج سلف" کا جائزہ (قسط اول)

اہل بدعت سے "ہجر"(۱) کے مسئلے میں ڈاکٹر زبیر صاحب کی تدلیس وخیانت:

ڈاکٹر زبیر نے چند دنوں قبل منہج سلف کی مخالفت میں ایک مناظراتی پروگرام ریکارڈ کروایا۔ پروگرام از ابتدا تا انتہا تدلیس، خیانت، سطحیت اور بے تکے استدلالات سے پر ہے۔ میں ان شاء اللہ سلسلہ وار اقساط کی شکل میں ان کی تدلیس اور خیانت کا پردہ فاش کرتا رہوں گا۔ اللہ رب العالمین ہم سب کو منہج سلف پر قائم ودائم رکھے۔ آمین۔

چونکہ مجھے سب سے پہلے وہ ویڈیو بھیجی گئی ہے جس میں ہجر المبتدع پر گفتگو کی گئی ہے، لہٰذا میں رد کی ابتدا ہجر المبتدع پر گفتگو سے کروں گا۔

ڈاکٹر زبیر نے ہجر المبتدع کی تردید میں ایک حدیث ذکر کی ہے جسے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "لا يحلُّ لمسلمٍ أنْ يهجُرَ أخاهُ فوق ثلاثٍ". (کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرے)۔

حدیث مذکور سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: "دیکھیں اس میں تو ہجر کے متعلق ہی گفتگو ہو رہی ہے نا"۔

قارئین کرام! یاد رہے کہ گفتگو "ہجر المبتدع" کے متعلق چل رہی تھی جس کا رخ ڈاکٹر صاحب نے "مطلق ہجر" کی طرف موڑ دیا اور پھر اُس حدیث سے استدلال کیا جو "مطلق ہجر" کے متعلق وارد ہوئی ہے۔

وجہ استدلال کا ذکر کرتے ہوئے مزید فرماتے ہیں: "بدعتی چونکہ کافر نہیں ہے، لہٰذا اس سے تین دنوں سے زیادہ قطع تعلق نہیں کیا جائے گا"۔

---

(۱) "ہجر" کہتے ہیں بائیکاٹ کرنے اور تعلق توڑنے کو۔ ہجر المبتدع سے مقصود اہل بدعت کا بائیکاٹ کرنا ہے۔

جس حدیث سے ڈاکٹر زبیر صاحب نے اہل بدعت سے تین دنوں سے زیادہ قطع تعلق کی ممانعت پر استدلال کیا ہے اس حدیث پر گفتگو کے لئے بطور مقدمہ چند سوالات آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

۱. کیا سلف صالحین نے حدیث مذکور سے وہی معنی مراد لیا ہے جو ڈاکٹر زبیر صاحب نے بیان ہے؟
۲. کیا "ہجر و مقاطعہ" کے تعلق سے صرف یہی ایک حدیث وارد ہوئی ہے؟
۳. کیا حدیث "لا يحلُّ لمسلمٍ أنْ يهجُرَ أخاهُ فوق ثلاثٍ" سے اہل بدعت مراد ہیں؟
۴. کیا حدیث مذکور کی تخصیص میں کوئی دوسری حدیث وارد ہوئی ہے؟

قبل اس کے کہ میں "ہجر المبتدع" کے مسئلے پر گفتگو کروں، مناسب سمجھتا ہوں کہ اہل سنت کے دو اہم اصول آپ کے سامنے بیان کر دوں۔ پہلا اصول یہ ہے کہ اہل سنت جب کسی مسئلے میں گفتگو کرتے ہیں تو اس میں وارد تمام احادیث کو جمع کر کے اپنے استدلال کی بنا رکھتے ہیں جبکہ ان کے بالمقابل اہل بدعت ایک ہی مسئلے کے متعلق وارد تمام احادیث سے استدلال نہیں کرتے بلکہ بعض احادیث کو لیتے اور بعض کو ترک کر دیتے ہیں۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ اہل سنت نصوص کے فہم میں صحابہ کرام اور سلف صالحین کے فہم کو اپنے فہم پر ترجیح دیتے ہیں، جبکہ ان کے برعکس اہل بدعت حدیث کے فہم میں صحابہ اور سلف کے فہم کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ نصوص کا اپنا من گھڑت نیا معنی بتاتے ہیں۔ اپ فرقوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں تمام فرقوں کی گمراہی کے بنیادی اسباب میں سے فہم صحابہ اور فہم سلف سے روگردانی ہے۔

ڈاکٹر زبیر صاحب نے دونوں اصول میں اہل سنت کی مخالفت اور اہل بدعت کی موافقت کی ہے جس کی تفصیل ذیل میں بیان کی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

میں سب سے پہلے حدیث سے سلف صالحین کی مراد بیان کروں گا پھر اس مسئلے میں وارد دیگر احادیث آپ کے سامنے پیش کروں گا تاکہ ڈاکٹر صاحب کی تدلیس سے آپ احباب پورے طور سے آگاہ ہو جائیں۔

حدیث "لا يحلُّ لمسلمٍ أنْ يهجُرَ أخاهُ فوق ثلاثٍ" کی شرح میں علماے سلف کے اقوال:

امام ابن الجوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اعْلَم أَن تَحْرِيم الْهِجْرَة بَين الْمُسلمين أَكثر من ثَلَاث إِنَّمَا هُوَ فِيمَا يكون بَينهم من عتب وموجدة، أَو لتقصير يَقع فِي حُقُوق الْعشْرَة وَنَحْو ذَلِك، فَهَذَا يحد لَهُ ثَلَاثَة أَيَّام". (۱)

"معلوم ہونا چاہئے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے تین دن سے زائد قطع تعلق کی حرمت کا جو مسئلہ ہے اس کا تعلق آپسی رنجش، باہمی ناراضگی اور معاشرتی اور اس کے ہم مثل دیگر دنیوی حقوق میں کوتاہی ہونے سے متعلق ہے۔ ان جیسے امور کی بناپر قطع تعلق کرنے کی مدت تین دن سے زائد نہیں ہے"۔

ابو الفضل العراقی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: "هَذَا التَّحْرِيمُ مَحَلُّهُ فِي هِجْرَانٍ يَنْشَأُ عَنْ غَضَبٍ لِأَمْرٍ جَائِزٍ لَا تَعَلُّقَ لَهُ بِالدِّينِ فَأَمَّا الْهِجْرَانُ لِمَصْلَحَةٍ دِينِيَّةٍ مِنْ مَعْصِيَةٍ أَوْ بِدْعَةٍ فَلَا مَنْعَ مِنْهُ". (۲)

"اس حرمت کا تعلق ایسے مسئلے سے ہے جس میں قطع تعلق کا سبب کوئی دنیوی امر مباح ہو جس کا دین سے کوئی تعلق نہ ہو۔ رہا کسی دینی مصلحت کی بناپر قطع تعلق کرنا، مثلاً گناہ یا بدعت کے سبب مقاطعہ کرنا تو اس صورت میں (تین دن سے زائد قطع تعلق کی) کوئی ممانعت نہیں ہے"۔

امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وهذا في هجران من يدعوك إلى هجرة عتب أو جفوة أو ما أشبه ذلك من باب الأخلاق وحقوق المعاشرة، فأما من أتي معصية أو جنى على الدين وأهله جنايةً/ فقد حلّت الرخصة في عقوبته بالهجران أكثر من ذلك". (۳)

---

(۱) کشف المشکل من حدیث الصحیحین (۸۶/۲).

(۲) طرح التثریب فی شرح التقریب: (۹۸/۸).

(۳) أعلام الحدیث (شرح صحیح البخاری): (۲۱۸۸/۳).

"یہ حدیث اس شخص سے قطع تعلق کے ساتھ مخصوص ہے جس سے قطع تعلق کا سبب آپسی رنجش اور کشیدگی یا اس جیسی دوسری چیزیں ہوں جن کا تعلق اخلاقی اور معاشرتی امور سے ہے، البتہ وہ شخص جس نے گناہ کا ارتکاب کیا ہو یا دین پر اور دینداروں پر کوئی زیادتی کی ہو تو بطور سزا اس سے تین دن سے زائد بھی قطع تعلق کرنا جائز ہے"۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "النهي عن الهجران فوق ثلاثة أيام إنما هو فيمن هجر لحظ نفسه ومعايش الدنيا وأما أهل البدع ونحوهم فهجرانهم دائما". (۱)

"تین دن سے زائد قطع تعلق کی ممانعت اس شخص کے حق میں ہے جس نے ذاتی مسئلے کی بنا پر یا معاشرتی (دنیوی) مسئلے کی بنا پر قطع تعلق کیا ہو، البتہ اہل بدعت اور ان کے ہم مثل لوگوں سے قطع تعلق دائمی طور پر ہوگا"۔

امام ابن رجب رحمہ اللہ حدیث میں شرح میں لکھتے ہیں: «وكل هذا في التقاطع للأمور الدنيوية ، فأما لأجل الدين فتجوز الزيادة على الثلاث ، نص عليه الإمام أحمد»- "تین دن سے زیادہ قطع کلامی کی ممانعت کا تعلق دنیوی امور کی بنا پر قطع کلامی کرنے سے ہے، رہا دین کی بنیاد پر قطع کلامی کرنا تو تین دن سے زائد بھی جائز ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے اس کی صراحت موجود ہے"۔ (۲)

امام ابن الملقن رحمہ اللہ حدیث «لا يحل لمسلم أن يهجر أخاه فوق ثلاث» **کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:** «وهو صريح في تحريم الهجران فوق ثلاث، وكذا العداوة والإعراض عن المسلم حرامان، وهذا فيمن لم يجن على الدين جناية، فأما من جنى عليه، وعصى ربه، فجاءت الرخصة (في عقوبته) بالهجران، كالثلاثة المتخلفين عن غزوة تبوك، أمر الشارع بهجرانهم، فبقوا كذلك خمسين ليلة، حتَّى نزلت توبتهم». "یہ حدیث تین دن سے زائد قطع کلامی کی حرمت پر دلالت کرتی ہے نیز کسی مسلمان سے عداوت کرنے اور اعراض برتنے کی حرمت کو بھی شامل ہے، البتہ اس حرمت کا تعلق ان لوگوں سے ہے جنہوں نے دین کے معاملے میں ظلم وزیادتی نہ کی ہو، مگر جس نے دین پر ظلم کیا اور اپنے رب کی نافرمانی کا مرتکب ٹھہرا اسے قطع تعلق کی سزا دینے کی رخصت آئی ہے، چنانچہ شریعت نے غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے

---

(۱) شرح النووی علی مسلم: (۱۰۶/۱۳).

(۲) (جامع العلوم والحکم: (۹۸۰/۳-۹۸۱)۔

والے تین صحابہ کرام سے قطع کلامی کا حکم دیا، پچاس دنوں تک تمام صحابہ کرام نے ان سے کوئی گفتگو نہ کی یہاں تک کہ ان کی توبہ کی قبولیت کا اعلان کیا گیا"۔

دین کی بنیاد پر تین دن سے زائد قطع تعلق کے دلائل:

پہلی دلیل: حضرت کعب بن مالک اور دیگر دو صحابہ کرام جب غزوہ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے تو نبی اکرم ﷺ نے تمام صحابہ کرام کو ان سے قطع تعلق اور قطع کلامی کا حکم دیا تھا جس کی مدت ۵۰ رات تھی۔ قصہ صحیح بخاری میں مذکور ہے اور نہایت طویل ہے۔ محل شاہد یہ ہے کہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "فلبثنا على ذلك خمسين ليلة"۔(۱) "ہم نے ۵۰ راتیں اسی حالت میں گزاری"۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں سب سے پہلے «لا يحل لمسلم أن يهجر أخاه فوق ثلاث ليال» والی حدیث ذکر کی ہے اور اس پر عنوان لگایا ہے: "باب الهجرة" (کسی سے قطع تعلق کا بیان)۔ اس باب کے معاً بعد ہی ایک دوسرا باب باندھا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: "باب ما يجوز من الهجران لمن عصى" "اہل معاصی سے علی الاطلاق قطع تعلق کے جواز کا بیان"۔ نیز اس تبویب پر حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے مذکورہ واقعہ سے استدلال کیا ہے۔(۲)

امام طبری رحمہ اللہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "قال الطبرى: وفى حديث كعب بن مالك أصل فى هجران أهل المعاصى والفسوق والبدع، ألا ترى أنه عليه السلام نهى عن كلامهم بتخلفهم عنه، ولم يكن ذلك كفرًا ولا ارتدادًا، وإنما كان معصية ركبوها، فأمر بهجرتهم حتى تاب الله عليهم، ثم أذن فى مراجعتهم، فكذلك الحق فيمن أحدث ذنبًا خالف به أمر الله ورسوله فيما لا شبهة فيه ولا تأويل، أو ركب معصية على علم أنها معصية لله أن يهجر غضبًا لله ورسوله، ولا يكلم حتى يتوب وتعلم توبته علمًا ظاهرًا كما قال فى قصة الثلاثة الذين خلفوا.(۳)

---

(۱) صحیح البخاری: (۵/۶)۔

(۲) صحیح البخاری: (۲۱/۸)۔

(۳) شرح صحیح البخاری لابن بطال: (۲۷۲/۹)۔

"کعب بن مالک رضی اللہ کی حدیث میں اہل فسق، اہل معاصی اور اہل البدع سے قطع تعلق کی بابت اصول بیان کیا گیا ہے، دیکھو کس طرح نبی اکرم ﷺ نے ان صحابہ سے گفتگو کرنے سے منع کر دیا جبکہ معاملہ کفر وارتداد تک نہیں پہنچا تھا۔ انہوں نے تو بس ایک گناہ کا ارتکاب کیا تھا۔ باوجود اس کے نبی اکرم ﷺ نے ان سے قطع تعلق کا حکم دیا اور دوبارہ ان سے بات چیت کی اجازت اس وقت تک نہیں دی جب تک کہ اللہ رب العالمین نے ان کی توبہ قبول نہ کر لی۔ لہذا یہی معاملہ ان کے ساتھ بھی کیا جائے گا جس نے اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کرتے ہوئے ہوئے کوئی ایسی بدعت ایجاد کی جس میں کسی قسم کے شبہ اور کسی طرح کے تاویل کی کوئی گنجائش نہیں یا گناہ کا علم ہو جانے کے بعد بھی اس میں ملوث رہا۔ اس قسم کے لوگوں سے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر غصہ کا اظہار کرتے ہوئے قطع تعلق کیا جائے گا اور ان سے اس وقت تک بات نہیں کی جائے گی جب تک کہ وہ توبہ نہ کر لیں اور ان کی توبہ لوگوں کے درمیان مشہور نہ ہو جائے جیسا کہ کعب بن مالک اور ان کے دونوں ساتھیوں کے قصہ میں اس کی صراحت موجود ہے"۔

دوسری دلیل: "عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ، أَنَّ قَرِيبًا لِعَبْدِ اللهِ بْنِ مُغَفَّلٍ خَذَفَ، قَالَ: فَنَهَاهُ، وَقَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنِ الْخَذْفِ، وَقَالَ: «إِنَّهَا لَا تَصِيدُ صَيْدًا، وَلَا تَنْكَأُ عَدُوًّا، وَلَكِنَّهَا تَكْسِرُ السِّنَّ، وَتَفْقَأُ الْعَيْنَ»، قَالَ: فَعَادَ، فَقَالَ: أُحَدِّثُكَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْهُ، ثُمَّ تَخْذِفُ، لَا أُكَلِّمُكَ أَبَدًا". (۱)

"سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کے ایک قریبی رشتہ دار نے ایک چھوٹی کنکری پھینکی تو عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے اسے منع کرتے ہوئے فرمایا: نبی اکرم ﷺ کنکری پھینکنے سے منع کیا ہے اور فرمایا: "یہ نہ شکار کر سکتی ہے اور نہ ہی دشمن کو نقصان پہنچا سکتی ہے البتہ اس سے لوگوں کے دانت ٹوٹ سکتے ہیں اور ان آنکھوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے"۔ راوی کہتے ہیں: اس شخص نے یہ سننے کے باوجود بھی دوبارہ یہی حرکت کی۔ یہ دیکھ کر حضرت عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ نے فرمایا: میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ نے کنکری پھینکنے سے منع کیا ہے اس کے باوجود بھی تم کنکری پھینک رہے ہو؟ میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گا"۔

---

(۱) صحیح مسلم: (۱۵۴۸/۳).

مہلب رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: "فيه من الفقه أن من خالف السنة أنه لا بأس بهجرانه وقطع الكلام عنه، وليس يدخل هجرانه تحت نهى النبى عن أن يهجر أخاه فوق ثلاث، يدل على ذلك أمر الرسول بذلك فى كعب بن مالك وصاحبيه".(۱)

"اس حدیث میں ایک عظیم فائدہ یہ ہے کہ سنت کی مخالفت کرنے والوں سے علی الاطلاق لا تعلقی اور قطع کلامی کی جائے گی، اور اس قسم کے لوگوں سے قطع تعلق اس حدیث کے عموم سے خارج ہے جس میں اپنے مسلم بھائی سے تین دن سے زائد مقاطعہ کرنے سے نبی اکرم ﷺ نے منع کیا ہے، اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے حضرت کعب بن مالک اور ان کے دونوں ساتھیوں سے مقاطعہ کا حکم دیا تھا"۔

بلکہ امام ابن عبد البر رحمہ اللہ نے اہل بدعت اور ان کے مثل دیگر مفسدین سے قطع تعلق کرنے پر اجماع نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: "وأجمع العلماء على أنه لا يجوز للمسلم أن يهجر أخاه فوق ثلاث إلا أن يكون يخاف من مكالمته وصلته ما يفسد عليه دينه أو يولد (به) على نفسه مضرة في دينه أو دنياه فإن كان ذلك فقد رخص له في مجانبته وبعده ورب صرم جميل خير من مخالطة مؤذية".(۲)

"علما کا اجماع ہے کہ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ قطع تعلقی کرے الا یہ کہ اس سے گفتگو کرنے اور تعلق رکھنے سے اپنے دین کے بگڑنے کا خوف کھاتا ہو یا دینی اور دنیوی اعتبار سے کسی نقصان کا ڈر ہو تو ایسی صورت میں اس شخص سے دوری اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بسا اوقات اچھے انداز سے قطع تعلق کر لینا تکلیف دہ تعلقات سے بہتر ہوتا ہے"۔

تیسری دلیل: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب معلوم ہوا کہ صبیغ نامی ایک شخص قرآن کریم کی متشابہ آیات کے متعلق سوال پوچھتا پھر رہا ہے تو آپ نے اسے بلا کر پہلے کوڑوں سے مارا پھر جب اس نے اقرار کیا کہ اب اس کے ذہن سے اس قسم کے سوالات نکل چکے ہیں تو اسے اس کے شہر بصرہ واپس بھیج دیا اور ساتھ ہی لوگوں کو اس کے ساتھ گفتگو سے منع کر دیا۔

---

(۱) شرح صحیح البخاری لابن بطال: (۳۸۹/۵).

(۲) التمہید لما فی الموطأ من المعانی والأسانید: (۱۲۷/۶).

چنانچہ ابو عثمان النہدی رحمہ اللہ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "ثم كتب إلى أهل البصرة: ألا تجالسوه". (۱)
"پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل بصرہ کو خط لکھا کہ اس کی مجالست سے دور رہیں"۔

قارئین کرام! مندرجہ بالا سطور میں «لا يحل لمسلم أن يهجر أخاه فوق ثلاث» کا درست معنی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اہل بدعت سے قطع تعلقی پر حدیث اور اقوال سلف کی روشنی میں نہایت اختصار کے ساتھ کچھ باتیں آپ کے سامنے رکھی گئیں۔ ان احادیث اور فہم سلف کو دیکھنے اور پڑھنے کے بعد ایک عام شخص بھی با آسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ڈاکٹر زبیر صاحب نے ہمیشہ کی طرح اس باب میں بھی اہل بدعت کے قدم بہ قدم چلتے ہوئے اپنی تائید میں وارد حدیث بیان کر کے عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے نیز فہم سلف کی مخالفت کرتے ہوئے حدیث کا خود تراشیدہ مفہوم عوام کے سامنے بیان کیا ہے۔ اللہ ہمیں اس قسم کے انحرافات سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

(۱) شرح کتاب الإبانة من أصول الديانة: (۳/۱۳، بترقیم الشاملة آلیا)۔

مامون رشید بن ہارون رشید سلفی
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

عقائد کے باب میں منہج سلف کی وسطیت

سلفی دعوت وسطیت، میانہ روی اور اعتدال پسندی کا حسین مظہر ہے، جو کہ ہر قسم کی مبالغہ آرائی، انتہا پسندی، غلو وتطرف، اور تمام طرح کی تساہل پسندی اور تفریط وتقصیر سے کوسوں دور ہے۔

جس طرح دین اسلام تمام ادیان و مذاہب کے مابین افراط و تفریط سے پاک معتدل ومتوسط دین ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلۡنَٰكُمۡ أُمَّةٗ وَسَطٗا لِّتَكُونُواْ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ وَيَكُونَ ٱلرَّسُولُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيدٗا﴾۔(۱) اسی طرح منہج سلف اور مسلک اہل الحدیث بھی اسلام کی طرف انتساب کرنے والے تمام عقدی فقہی اور فکری مسالک کے مابین وسطیت واعتدال کا علمبردار ہے، واضح رہے کہ یہاں وسطیت کا مطلب مطلقاً "بیچ کا راستہ" اور "درمیانہ موقف" نہیں ہے بلکہ ہر وہ بات معتدل ومتوسط ہے جو قرآن و سنت سے ثابت ہے اور جس پر ائمہ سلف چلے ہیں خواہ مغرضین وحاسدین، دشمنان دین اور مشککین وملبّسین اسے کچھ بھی کہتے ہوں، ان کی باتوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے، مثال کے طور پر متجددین شرعی حدود وقصاص جیسے رجم اور چوری وغیرہ کی سزاؤں کو انتہاء پسندی اور ظلم سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ یہ عین وسطیت ہے کیونکہ یہ رب العالمین کا حکم ہے جو قرآن کریم کے اندر صراحتاً موجود ہے، اسی طرح بعض مغرب زدہ مسلمان مفکرین حجاب کے وجوب اور مرد وزن کے اختلاط کی ممانعت کو تنگ نظری، قدامت پسندی اور بنیاد پرستی کا نام دیتے ہیں جبکہ یہ واضح شرعی احکام ہیں۔

دور جدید کے عقلانیت زدہ افراد احادیث نبویہ کا انکار سرے سے کرتے ہیں جبکہ محدثین کرام ہر طرح کی مقبول احادیث سے احتجاج واستدلال کرتے ہیں خواہ وہ متواتر ہوں یا آحاد، اب ان دونوں آراء کے مقابلے میں معتدل ومتوسط رائے یہ تو نہیں ہو سکتی کہ مکمل انکار یا کامل اقرار وقبول کے بجائے متواتر کو قبول کیا جائے اور آحاد کو ٹھکرا دیا جائے؟!!! بلکہ وسطیت وہی ہے جو حق ہے کہ ہر وہ حدیث مقبول ہے جس کے اندر مقبول حدیث کی تمام شرائط پائی جاتی ہیں۔

ذیل میں عقائد کے باب میں اہل الحدیث والسنہ کے اعتدال ووسطیت کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

---

(۱)(البقرۃ ۱۴۳)۔

(۱) **اسماء وصفات کے باب میں وسطیت:** اس باب میں اہل قبلہ کے منجملہ تین گروہ ہیں، جن میں سے دو افراط و تفریط کی انتہاؤں پر ہیں اور ایک متوسط و معتدل ہے۔

پہلا گروہ: ممثلہ ومشبہ کا ہے، جو اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء وصفات بالکل ہمارے یعنی مخلوقات کے اسماء وصفات کے مماثل ومشابہ ہیں، اس گروہ کے موقف میں حق اور باطل دونوں ہیں، حق یہ ہے کہ یہ اسماء وصفات کا اثبات کرتے ہیں، اور باطل یہ ہے کہ یہ مماثلت ومشابہت کا عقیدہ رکھتے ہیں، پس ان لوگوں نے اسماء وصفات کا اثبات کرنے والے دلائل پر پوری توجہ مرکوز رکھی اور مماثلت کی نفی کرنے والے دلائل سے غلفت برتی اور انہیں پس پشت ڈال دیا، لہٰذا ان کے ہاں "اثبات" کے معاملے میں غلو اور انتہا پسندی ہے، چنانچہ یہ لوگ اثبات کے سلسلے میں شرعی حد پر نہ رکے بلکہ اس سے تجاوز کیا اور مبالغہ آرائی سے کام لیا یہاں تک تمثیل وتشبیہ کی بدعت میں جا گرے، سب سے پہلا شخص جس نے تمثیل کی بات کی اور کہا کہ "اللہ کی صفات ہماری صفتوں جیسی ہیں" وہ زندیق ہشام بن الحکم رافضی تھا۔

دوسرا گروہ: معطلہ کا ہے، خواہ وہ کلی طور پر اسماء وصفات باری تعالیٰ کے منکرین جہمیہ ہوں یا صرف صفات الٰہیہ کے منکرین معتزلہ ہوں، یا پھر تاویل کرنے والے اشاعرہ وماتریہ اور کلابیہ وغیرہ ہوں، جو اس بات کے قائل ہیں کہ ہم اللہ جل شانہ کی مخلوقات سے مماثلت ومشابہت کی تنزیہ کرتے ہیں، اور اس کے لئے یہ لوگ تمام اسماء وصفات یا بعض صفات کی تاویل اور نفی کرتے ہیں، اس موقف میں بھی حق اور باطل دونوں ہیں، حق یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات سے مماثلت کی تنزیہ و نفی کرتے ہیں اور باطل یہ ہے کہ یہ سرے سے اسماء وصفات ہی کی نفی کر ڈالتے ہیں، پس ان لوگوں نے مماثلت کی نفی کرنے والے دلائل پر پوری توجہ مرکوز رکھی اور اسماء وصفات کا اثبات کرنے والے دلائل سے بے اعتنائی برتی، سو ان کے ہاں "تنزیہ" کے باب میں غلو اور افراط ہے، چنانچہ یہ لوگ تنزیہ کے سلسلے میں شرعی حد پر نہ رکے بلکہ اس سے تجاوز کیا اور مبالغہ آرائی سے کام لیا یہاں تک کہ تعطیل وانکار کی گمراہی میں جا گرے، اس گروہ کا سرغنہ جعد بن درہم، بشر المریسی، اور جہم بن صفوان ہیں، جہمیہ معتزلہ اشاعرہ اور ماتریدیہ اسی انتہاء پر کھڑے ہیں اور انہیں گمراہوں کی راہوں کے راہی ہیں، قابلِ غور بات یہ ہے کہ تمثیل وتشبیہ کے قائلین نے جن دلائل پر اعتماد کیا ہے وہ وہی دلائل ہیں جنہیں معطلہ نے قابل التفات نہیں سمجھا اور پس پشت ڈال دیا ہے، اور اہل تعطیل نے جن دلائل سے استدلال کیا ہے وہ وہی دلائل ہیں جنہیں ممثلہ نے ترک کر دیا ہے، جبکہ اہل السنہ

اہل الحدیث نے دونوں طرف کے دلائل کو قبول کیا ہے اور تمام دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی روشنی میں اپنا عقیدہ اختیار کیا ہے۔

تیسرا گروہ: اہل السنہ اہل الحدیث کا ہے، جو منہج سلف صالحین کے علم بردار ہیں، اور اس بات کے قائل ہیں کہ ہم ان تمام اسماء وصفات کا اثبات کرتے ہیں جو کتاب اللہ اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات سے مماثلت ومشابہت کی تنزیہ اور نفی کرتے ہیں، چنانچہ نہ تو تمثیل وتشبیہ بیان کرتے ہیں، نہ ہی کیفیت بتلاتے ہیں اور نہ تعطیل وتحریف اور تاویل کرتے ہیں، پس نہ تو ان کا اثبات ممثلہ کے اثبات کی طرح ہے جو اثبات کے ساتھ تمثیل وتشبیہ کا عقیدہ رکھتے ہیں اور تنزیہ سے صرف نظر کرتے ہیں، اور نہ ان کی تنزیہ معطلہ کی تنزیہ کی طرح ہے جو تنزیہ کے نام پر اسماء وصفات کی تعطیل وانکار کرتے ہیں، بلکہ وہ ایسا اثبات کرتے ہیں جس میں تمثیل نہیں ہوتی اور ایسی تنزیہ کرتے ہیں جس میں تعطیل وانکار نہیں ہوتا، اور یہ عقیدہ اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿لَيۡسَ كَمِثۡلِهِۦ شَيۡءٞۖ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلۡبَصِيرُ﴾ (۱) سے ماخوذ ہے، ﴿لَيۡسَ كَمِثۡلِهِۦ شَيۡءٞ﴾ کے اندر ممثلہ پر رد ہے اور تمثیل کی نفی ہے، اور ﴿وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلۡبَصِيرُ﴾ کے اندر معطلہ پر رد ہے اور تعطیل وانکار کی نفی ہے۔

یہی "وسطیت" ہے، جو اہل الحدیث کا خاصہ اور امتیاز ہے، چنانچہ اہل السنہ اس باب میں اثبات بھی کرتے ہیں اور تنزیہ بھی، اور دونوں اطراف کے دلائل پر عمل کرتے ہیں، پس ان کا اثبات بھی معتدل ہے اور تنزیہ بھی معتدل، نہ تو وہ افراط کے شکار ہیں اور نہ ہی تفریط کے مریض۔

(۲) قضاء وقدر کے باب میں وسطیت: اس باب میں اہل قبلہ کے تین فرقے ہیں، ایک افراط کا شکار ہے، دوسرا تفریط کا، اور تیسرا وسطیت واعتدال کے شرف سے مشرف ہے۔

پہلا فرقہ: جبریہ کا ہے، جو کہتے ہیں کہ ہر شے اللہ تعالیٰ کے قضاء وقدر سے وقوع پذیر ہوتی ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ بندوں کے پاس کوئی قدرت اور کچھ بھی اختیار نہیں ہے، وہ جو کچھ کرتے ہیں اس کے کرنے پر مجبور ہیں، وہ خود نہیں کرتے بلکہ ان سے کروایا جاتا ہے، حقیقی فاعل تو اللہ تعالیٰ ہیں، وہ ہوا کے رخ پر پڑے پنکھ اور توے پر پڑے روٹی کی طرح ہیں، ان کے پاس مطلقاً کوئی قدرت اور کسی بھی قسم کا اختیار نہیں ہے۔

---

(۱) (الشوریٰ ۱۱)۔

ان کے اس موقف میں حق بھی ہے اور باطل بھی، حق یہ ہے کہ یہ لوگ تقدیر کا اثبات کرتے ہیں، اور یہ اقرار کرتے ہیں کہ ہر چیز اللہ کی قدرت سے وقوع پذیر ہوتی ہے، اور باطل یہ ہے کہ یہ بندوں سے مکمل طور پر علی الاطلاق ہر قسم کی قدرت واختیار کی نفی کرتے ہیں، پس ان کے ہاں "اثبات تقدیر" کے باب میں غلو وتطرف ہے، چنانچہ ان لوگوں نے ان دلائل کو لازم پکڑا ہے جن میں تقدیرِ سابق اور کتابتِ سابقہ کا اثبات ہے، لیکن ان دلائل کو پس پشت ڈال دیا ہے جن کے اندر فعل کی نسبت بندوں کی طرف کی گئی ہے۔

دوسرا فرقہ: قدریہ کا ہے، جو قضاء وقدر کے منکر ہیں، اور کہتے ہیں کہ بندوں کے پاس مکمل قدرت اور مطلق اختیار موجود ہے، وہ خود اپنے افعال کے موجِد اور خالق ہیں، سابقہ تقدیر سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ بندوں کی مشیت اور اللہ کی مشیت کے مابین بھی کوئی ربط وتعلق نہیں ہے۔

ان میں سے بعض لوگ کتابتِ تقدیر، اللہ تعالیٰ کے علمِ سابق اور مشیتِ سابقہ کے بھی منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ چیزیں اچانک وقوع پذیر ہو جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ کو بندوں سے صادر ہونے والے افعال کا صدور ووقوع سے پہلے کوئی علم نہیں ہوتا، اسی قسم کے لوگوں کو صحابہ نے کافر قرار دیا تھا، یہ غالی قسم کے قدریہ ہیں، جبکہ متاخرین قدریہ علم سابق کا اثبات کرتے ہیں لیکن بندوں کو ہی اپنے افعال کا خالق قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ انہیں مطلق قدرت واختیار حاصل ہے، ان سب کے ہاں "اثبات تقدیر" کے باب میں تفریط وتقصیر ہے اور انہوں نے ان دلائل کو حرزِ جاں بنالیا ہے جن کے اندر فعل کی نسبت بندوں کی طرف کی گئی ہے لیکن ان لوگوں نے ان دلائل سے غلفت برتی ہے جو تقدیر سابق کا اثبات کرتے ہیں، چنانچہ جبریہ "اثبات تقدیر" میں افراط کے شکار ہیں یہاں تک کہ بندوں سے اختیار وقدرت کی مطلق نفی کرتے ہیں، اور قدریہ "اثبات تقدیر" میں تفریط کے شکار ہیں یہاں تک کہ بندوں کو ہی خالق قرار دیتے ہیں اور ان کے لئے مطلق طور پر مکمل قدرت واختیار اور مشیت کا اثبات کرتے ہیں، اس طرح سے دونوں فرقوں کے ہاں انتہاء پسندی ہے اور دونوں نے دلائل کے ایک سرے کو پکڑا ہے اور دوسرے سرے کو چھوڑ دیا ہے۔

تیسرا فرقہ: اہل الحدیث سلفیوں کا ہے، جو تقدیر سابق اور اس کے چاروں مراتب، علم، کتابت، مشیت اور خلق کا اثبات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کائنات میں جو کچھ ہوا، ہوتا اور ہونے والا ہے اللہ تعالیٰ کو ازل سے ان سب کا علم ہے، کوئی چھوٹی سے چھوٹی اور دقیق سے دقیق تر شے اس کے علم سے خارج نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی تخلیق سے پچاس ہزار

سال قبل ان تمام امور کی تفاصیل کو لکھ لیا ہے، اور اس کائنات کے اندر جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اس کی قدرت ومشیت اور اختیار سے ہوتا ہے، اور وہی تمام مخلوقات کے افعال اور حرکات وسکنات کا خالق ہے۔

نیز یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ بندوں کے پاس بھی اختیار اور قدرت ہے جس سے وہ چیزوں کے مابین انتخاب کر سکتے ہیں اور مختلف راستوں کے بیچ صحیح اور مناسب راستے کو اپنے لئے چن سکتے ہیں، پس اہل الحدیث دونوں باتوں پر ایمان رکھتے ہیں، چنانچہ تقدیر الٰہی کا اثبات بھی کرتے ہیں اور بندوں کے لئے اختیار وقدرت اور مشیت کا اثبات بھی کرتے ہیں، نہ تو ان کے ہاں افراط ہے اور نہ ہی تفریط، بلکہ وہ دونوں طرف کے دلائل کو قبول کرتے ہیں اور دونوں گروہوں کے پاس جو حق موجود ہے اسے اپناتے ہیں، اور باطل کو دیوار پر دے مارتے ہیں، جبریہ کے پاس جو حق ہے وہ تقدیر کا اثبات ہے اور قدریہ کے پاس جو حق ہے وہ بندوں کے لئے قدرت واختیار کا اثبات ہے اور اہل السنہ ان دونوں کو قبول کرتے ہیں۔

(۳) مرتکب کبیرہ کے دنیاوی حکم کے مسئلہ میں وسطیت: اس مسئلہ میں اہل قبلہ کے تین گروہ ہیں:

پہلا گروہ: مرجئہ کا ہے، جو کہتے ہیں کہ گناہ کا ایمان کی کمی پر کوئی اثر نہیں ہوتا جب تک کہ وہ گناہ شرک نہ ہو، ایک مؤمن شخص کوئی بھی اور کتنا بھی بڑا گناہ کیوں نہ کر لے اگر وہ شرک نہیں کرتا تو اُس کا ایمان بالکل کامل ومکمل ہوتا ہے، اس کے ایمان میں ہرگز کسی بھی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی ہے، بلکہ ان میں سے بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ "سب سے بڑا فاسق وفاجر انسان کا ایمان ابو بکر وعمر اور جبرئیل کے ایمان" کی طرح ہے، ان کے نزدیک ایمان ایک ایسا جامد ومتصلب جزو ہے جس کے اجزاء نہیں ہوتے اور اسے کفر یا شرک کے علاوہ کوئی بھی گناہ نقصان نہیں پہنچاتا، ان کے ہاں اس مسئلہ میں انتہائی تفریط پائی جاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ صرف "وعد" اور رجاء سے متعلق دلائل کو لیتے ہیں اور تفریط وتساہل میں غلو کر جاتے ہیں۔

دوسرا گروہ: "وعیدیہ" کا ہے، جو کہتے ہیں کہ جب کوئی بندہ کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس سے مکمل طور پر "ایمان" کا لقب چھن جاتا ہے، ایسی صورت میں اسے ہرگز مؤمن نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ کبائر کے ساتھ ایمان کا وجود ممکن نہیں ہے، یہ خوارج ومعتزلہ اور ان کے ہم مشرب لوگ ہیں، ان سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مرتکب کبیرہ "مسمی ایمان" سے خارج ہو جاتا ہے، لیکن کیا اسے کافر کہا جا سکتا ہے؟ خوارج کہتے ہیں کہ ایسا شخص کافر ومرتد ہو جاتا ہے سو اسے کافر کہا جا سکتا ہے، جبکہ معتزلہ تھوڑی جھجھک کا مظاہرہ کرتے ہیں اور قدرے مہذب اسلوب میں کہتے ہیں کہ "نہ تو ہم اسے مؤمن کہیں گے

اور نہ ہی کافر کہیں گے "بلکہ وہ کفر اور ایمان دونوں مرتبوں کے بیچ میں ہوتا ہے، یعنی وہ دائرہ ایمان سے مکمل طور پر خارج ہو جاتا ہے لیکن دائرہ کفر کے اندر داخل نہیں ہوتا، یہ معتزلہ کی فریب دہی اور ملمع سازی ہے ورنہ معتزلہ کا قول بعینہ خوارج ہی کا قول ہے ان دونوں آراء میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ ایمان و کفر ایک دوسرے کا نقیض ہے اور دو متناقض چیزیں نہ تو بیک وقت جمع ہو سکتی ہیں اور نہ ہی بیک وقت مرتفع ہو سکتی ہیں، چنانچہ بندہ یا تو مومن ہو گا یا پھر کافر، لہٰذا اگر کوئی کسی سے "ایمان" کا وصف سلب کر لے تو وہ لازمی طور پر کافر ہو گا چاہے اسے کوئی بھی نام دے اور کچھ بھی کہے!!! اسی طرح یہ معتزلہ کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہے گا اب اگر وہ کافر نہیں ہے تو پھر خالد مخلد فی النار کیسے ہو گا؟! لہٰذا حقیقت یہی ہے کہ اس مسئلہ میں معتزلہ اور خوارج کے قول میں کوئی فرق نہیں ہے!!!

در اصل وجہ یہ ہے کہ وعیدیہ نے صرف وعید و تہدید کے تعلق سے وارد دلائل کو پیش نظر رکھا اور افراط و مبالغہ آرائی کے شکار ہو گئے، چنانچہ مرجئہ نے مرتکب کبیرہ کو کامل ایمان کے مقام پر فائز کر دیا، جبکہ وعدیہ نے مرتکب کبیرہ سے مطلق ایمان کی نفی کی اور انہیں دائرہ ایمان سے خارج قرار دیا، ایک گروہ نے افراط سے کام لیا تو دوسرے نے تفریط سے!

تیسرا گروہ: اہل السنہ والجماعہ کا ہے جو ان دونوں انتہاؤں کے بیچ اعتدال و وسطیت کی راہ پر گامزن ہیں، اور دونوں طرف کے دلائل کو قبول کرتے ہوئے تمام دلائل کی روشنی میں عقیدہ اخذ کرتے ہیں، چنانچہ وہ نہ تو ذنوب و معاصی کو غیر مؤثر قرار دیتے ہیں اور نہ ہی کبائر کی وجہ سے تکفیر کرتے ہیں، بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عمل ایمان کا رکن ہے، اچھے اعمال سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور برے اعمال اور گناہ کے کاموں سے ایمان میں کمی واقع ہوتی ہے، لیکن جب تک کوئی بندہ کفر یا شرک کا ارتکاب نہیں کرتا وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا ہے، ہاں گناہوں کی وجہ سے اس میں کمی اور کمزوری ضرور واقع ہوتی ہے، ان کے ہاں مرتکب کبیرہ "مؤمن بإیمانہ فاسق بکبیرتہ" ہے، یعنی مرتکب کبیرہ نہ تو پکا اور کامل مؤمن ہے اور نہ ہی دائرہ ایمان سے خارج کافر و مرتد ہے، بلکہ ناقص الایمان مؤمن اور گناہوں کی وجہ سے فاسق ہے۔

(۴) مرتکب کبیرہ کے اخروی انجام کے معاملے میں وسطیت: اس باب میں بھی اہل قبلہ کے تین فرقے ہیں:

پہلا فرقہ: مرجئہ کا ہے جو کہتے ہیں کہ ایک مسلمان اگر کفر یا شرک کا ارتکاب نہیں کرتا خواہ وہ کتنا بھی بڑے سے بڑا گناہ کیوں نہ کر لے پکا مؤمن رہتا ہے اور نتیجتاً آخرت میں اس کا ٹھکانا جنت ہے۔

دوسرا فرقہ: وعیدیہ خوارج ومعتزلہ کا ہے جو مرتکب کبیرہ کو دائرہ ایمان سے خارج قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آخرت میں ان کا ٹھکانا جہنم ہے، وہ ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ اس کا مستحق ہے۔

تیسرا فرقہ: اہل الحدیث سلفیوں کا ہے جو مرتکب کبیرہ یا کسی بھی مسلمان کے جنت یا جہنم میں داخل ہونے کا فیصلہ نہیں کرتے، چنانچہ نہ تو وہ یہ کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ ڈائریکٹ جنت جائے گا اور ہمیشہ اسی میں رہے گا اور نہ ہی یہ کہتے ہیں کہ ڈائریکٹ جہنم میں جائے گا اور ہمیشہ اسی میں رہے گا، بلکہ اسے اللہ کی مشیت میں چھوڑ دیتے ہیں کہ اگر اللہ چاہے تو اسے معاف کرکے اول وہلہ ہی میں جنت میں داخل کردے گا اور اگر چاہے تو جہنم میں داخل کرکے اسے اس کی گناہوں کے بقدر سزا دے گا اس کے بعد جنت میں داخل کرے گا، لیکن چونکہ وہ شرک یا کفر کا مرتکب نہیں ہے اس لئے بہر حال جنت کا مستحق ہے خواہ سزا بھگتنے کے بعد ہی کیوں نہ ملے جنت ضرور ملے گی۔

(۵) اہل بیت کے معاملے میں وسطیت: اس باب میں بھی اہل اسلام کے تین گروہ ہیں:

پہلا گروہ: رافضی شیعوں کا ہے، جو اہل بیت کے تعلق سے انتہائی مبالغہ آرائی اور افراط سے کام لیتے ہیں، چنانچہ وہ ان کے تعلق سے باطل اور کفریہ وشرکیہ عقائد رکھتے ہیں، اور انہیں گناہ خطا سے معصوم سمجھتے ہیں، نیز انہیں اللہ تعالیٰ کے اوصاف سے متصف کرتے ہوئے مقام ربوبیت پر فائز کردیتے ہیں، جیسے ان کا یہ کہنا کہ ائمہ اہل بیت عالم الغیب تھے، وہ بارش برسانے، اولاد دینے، ہوا چلانے، فتح یا شکست دینے وغیرہ پر قادر ہیں، جنت میں وہی داخل ہوں گے جنہیں اہل بیت چاہیں گے اور جہنم میں بھی وہی لوگ جائیں گے جنہیں اہل بیت بھیجیں گے، اسی لئے وہ ان سے مدد طلب کرتے ہیں، ان کے مزاروں پر رکوع وسجود کرتے ہیں، ان سے شفایابی کی دعا کرتے ہیں اور ان کے لئے مختلف قسم کے نذر ونیاز اور عبادت کرتے ہیں۔

دوسرا گروہ: خوارج وانواصب کا ہے جو پہلے گروہ کے بالکل برعکس ہیں، یہ اہل بیت سے بغض وحسد اور دشمنی کرتے ہیں اور ان کے خون ومال کو حلال سمجھتے ہیں، چنانچہ پہلا گروہ محبت میں افراط ومبالغہ کے شکار ہیں جس کی وجہ سے وہ انہیں مقام الوہیت وربوبیت پر فائز کردیتے ہیں، جبکہ دوسرا گروہ نفرت وعداوت میں انتہاء پسندی کے مریض ہیں یہاں تک کہ انہیں کفار سمجھ کر ان کا خون ومال حلال سمجھتے ہیں۔

تیسرا گروہ: اہل السنہ والجماعہ کا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اہل بیت سے محبت کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی کی محبت میں افراط اور مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتے کہ اسے ربانی خصوصیات اور مقام نبوت عطا کر دیں، اور جو ان سے بغض و نفرت کرتا ہے اللہ کے واسطے ہم اس سے بغض و نفرت کرتے ہیں، ہم ان سے محبت کرتے ہیں کیونکہ وہ مؤمن ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار ہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ غیر معصوم اور منجملہ انسانوں میں سے ہیں، جو اچھے کام بھی کرتے ہیں اور غلطیاں بھی کرتے ہیں، ان کے پاس نہ تو نبوی خصائص ہیں اور نہ الٰہی صفات، ان سے محبت دین ایمان اور احسان ہے جبکہ ان سے نفرت فسق ونفاق اور عصیان ہے، یہی اہل السنہ کا معتدل عقیدہ ہے چنانچہ ہم خوارج کے برعکس ان سے محبت کرتے ہیں اور روافض کے برعکس انہیں بشر سمجھتے ہیں اور ان کی شان میں مبالغہ آرائی نہیں کرتے!!!

(۶) عقل کی شرعی حیثیت کے مسئلہ میں وسطیت: معتزلہ اور ان کے ہم نوا متکلمین و فلاسفہ مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے عقل اور معقولات کو ہی کل کائنات سمجھتے ہیں اور معقولات کو حسیات اور نصوصِ کتاب وسنت پر بھی مقدم گردانتے ہوئے نصوص کو اس کے تابع قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ نصوصِ کتاب وسنت اخبار کے قبیل سے ہیں جن میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہے اور یہ ظنّیات ہیں قطعی نہیں ہیں، جبکہ معقولات قطعی ہیں، چنانچہ اپنے اس باطل اصول کے سہارے ان لوگوں نے نصوص سے ثابت بہت سارے اجماعی عقائد کا انکار کیا ہے جیسے عذاب قبر، شفاعت، رؤیت باری تعالیٰ اور میزان وغیرہ اور صفات الٰہیہ کی نفی کی ہے۔

اس کے برعکس بعض لوگ عقل کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں اور عقلی دلالت کو بالکل پس پشت ڈال دیتے ہیں، اور منقولات وحسیات کے تعلق سے غلو کرتے ہوئے احکام الٰہیہ وشرائعہ اسلامیہ کی علتوں اور حکمتوں کی نفی کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محض ارادہ کرتا ہے اور حکم دے دیتا ہے ان کے احکام کے پیچھے کوئی علت یا حکمت نہیں ہوتی۔

لیکن اہل الحدیث کا نظریہ یہ ہے کہ کوئی بھی صحیح معقول شے کسی بھی صحیح نصِ شریعت یا حِسِّ صحیح کے مخالف ومعارض نہیں ہو سکتی، اسی طرح کوئی بھی نقلِ سلیم کسی بھی عقل یا حسِ سلیم کے معارض نہیں ہو سکتی، چنانچہ اگر کہیں بظاہر ایسا لگتا ہو کہ عقل و نقل میں تعارض وتناقض ہے تو یا تو نقل صحیح وثابت نہیں ہوگی یا عقلی دلالت ناقص اور عقل غیر سلیم ہوگی، لیکن عقل کے ساتھ محض ظاہری تعارض کی وجہ سے نقلِ صحیح کا انکار یا تاویل نہیں کی جائے گی خواہ نقل متواتر ہو یا آحاد، اگر نقل صحیح وثابت ہو تو بہر حال وہ عقل پر مقدم ہوگی کیونکہ عقلی دلالت میں خطا کا وقوع ظاہر ہے جبکہ نصِ شریعت وحی الٰہی ہے اور وحی

میں غلطی کا تصور کفر ہے۔ چنانچہ اہل الحدیث نہ تو سرے سے عقل کو متروک و غیر معتبر قرار دیتے ہیں اور نہ ہی اسے نصوص کتاب و سنت پر مقدم اور ان پر حاکم و فیصل قرار دیتے ہیں بلکہ وسطیت کی راہ اپناتے ہوئے عقل سلیم کو قبول کرتے ہیں اور اس سے فہم نصوص میں مدد لیتے ہیں اور عقل فاسد کو ترک کر دیتے ہیں، جبکہ ظاہری تعارض کی صورت میں نقل صحیح کو عقل پر مقدم کرتے ہیں کیونکہ عقل سلیم نقل صحیح کے قطعاً معارض نہیں ہو سکتی لہٰذا اگر کہیں تعارض ہے تو اس کا مطلب وہ عقل عقل سلیم نہیں بلکہ عقلِ فاسد ہے اور وہ غیر معتبر ہے!

۷-شفاعت کے باب میں وسطیت: اس باب میں اہل قبلہ کے تین گروہ ہیں:

پہلا گروہ: بریلویہ وصوفیہ جیسے قبر پرست مشرکوں کا ہے، جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے معظم و مکرم اولیاء و صالحین اور وہ شجر و حجر اور قبریں وغیرہ جن کی یہ عبادت کرتے ہیں وہ بروز قیامت اللہ کے حضور ان کے لئے شفاعت کریں گے اور انہیں سیدھا جنت میں داخل کر دیں گے، ان کے ہاں "اثبات شفاعت" کے معاملے میں مبالغہ آرائی ہے، چنانچہ یہ ان کے لئے بھی شفاعت کا اثبات کرتے ہیں جن کی شفاعت کے بطلان کی دلیل نصوص کے اندر صراحتاً موجود ہے۔

دوسرا گروہ: منکرین شفاعت معتزلہ وغیرہ گمراہ فرقوں کا ہے، جو اس بات کے قائل ہیں کہ بروزِ قیامت شفاعت بے سود اور غیر مؤثر و مفید ہو گی، کیونکہ قرآن میں ہے ﴿فما تنفعهم شفاعة الشافعين﴾ (المدثر:۴۸) کہ انہیں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی، چنانچہ ان لوگوں نے تمام طرح کی شفاعتوں کا انکار کر دیا بالخصوص کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کے حق میں ہونے والی شفاعتوں کا، حالانکہ ان کا ثبوت نصوص کتاب و سنت میں واضح انداز میں موجود ہے۔ پس ان لوگوں نے شفاعت کے انکار میں مبالغہ آرائی سے کام لیا جیسا کہ قبر پرستوں نے شفاعت کے اثبات میں افراط و غلو کا مظاہرہ کیا، پہلوں نے ایسی شفاعتوں کا انکار کر دیا جو نصوص سے ثابت ہیں اور دوسروں نے ایسی شفاعتوں کا اثبات کیا جن کی کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ ان کی نفی موجود ہے، چنانچہ ایک گروہ نے افراط سے کام لیا تو دوسرے نے تفریط سے جبکہ اہل السنہ نے وسطیت واعتدال کا مظاہرہ کیا۔

تیسرا گروہ: اہل الحدیث والسنہ کا ہے، جو کہتے ہیں کہ ان شفاعتوں پر ایمان لانا واجب ہے جو نصوصِ صحیحہ صریحہ سے ثابت ہیں، اور تمام طرح کی بدعی، باطل اور غیر ثابت شفاعتوں کا انکار و تردید کرتے ہیں، چنانچہ وہ نہ تو مطلقاً تمام طرح کی شفاعتوں کا اثبات کرتے ہیں اور نہ ہی کلی طور پر انکار کرتے ہیں، بلکہ جو نصوص سے ثابت ہیں انہیں ثابت مانتے ہیں اور نصوص

نے جن کی نفی کی ہے ان کی نفی کرتے ہیں، کیونکہ شفاعت کا باب غیبیات میں سے ہے اور غیبی امور میں عقل کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

مشروع شفاعت کی مختلف قسمیں ہیں، بعض رسول اللہ کے ساتھ خاص ہیں جیسے شفاعت عظمی، مؤمنین کے دخول جنت کے لئے شفاعت، ابو طالب کے لئے تخفیف عذاب کی شفاعت اور بعض عام ہیں جو شافع ومشفوع کے لئے اللہ کی اجازت سے انبیاء فرشتے صدیقین شہداء اور صالحین کریں گے جیسے جہنم کے مستحق مرتکب کبیرہ کے لئے شفاعت، جہنم میں داخل ہو چکے گنہگاروں کو جہنم سے نکالنے یا ان کی عذاب میں تخفیف کرنے کے لئے شفاعت، اہل اعراف کے لئے شفاعت، اہل جنت کی بلندی درجات کے لئے شفاعت وغیرہ۔

۸-ایمان میں استثناء کے مسئلہ میں وسطیت:

اشاعرہ اور کلابیہ کہتے ہیں کہ ایمان میں استثناء واجب ہے، چنانچہ جب کوئی بندہ "أنا مؤمن" (میں مؤمن ہوں) کہے تو واجب ہے کہ اس کے بعد "إن شاء اللہ" بھی کہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تزکیہ نفس سے منع فرمایا ہے، فرمایا: ﴿فلا تزكوا أنفسكم﴾(۱) ﴿ألم تر إلى الذين يزكون أنفسهم﴾(۲) لہذا یہ واجب ہے کہ جب بھی کوئی "میں مؤمن ہوں" کہے ساتھ ہی ان شاء اللہ بھی کہے، تاکہ تزکیہ نفس جیسے حرام کام کا مرتکب نہ ہو، کیونکہ دل میں مضمر ایمان غیبیات میں سے ہے اور غیبی امور کے بارے میں بلا دلیل حتمی طور پر کوئی بات نہیں کہی جاسکتی!!!

اس کے برعکس ماتریدیہ، مرجئہ، معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ کا کہنا ہے کہ ایمان میں استثناء حرام ہے، کیونکہ استثناء شک پر دلالت کرتا ہے، اور ایک مؤمن بندہ اپنے اصل ایمان کے بارے میں کیوں کر شک کر سکتا ہے؟! کیونکہ "اصل ایمان" کے تئیں شک کرنا کفر ہے، اس بنیاد پر ایمان میں استثناء کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ جزم ویقین کے ساتھ یہ کہنا لازمی ہے کہ مؤمن ہوں۔

---

(۱)(النجم:۳۲)۔

(۲)(النساء:۴۹)۔

یہ دو متناقض اقوال ہیں، ایک گروہ وجوب کی بات کرتا ہے تو دوسرا حرمت کی، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں گروہوں نے صرف ایک ایک حالت کو مد نظر رکھا ہے، چنانچہ وجوب کے قائلین نے صرف کمال ایمان کی گواہی کی حالت کو مد رکھا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ کوئی مؤمن شخص اپنے کامل ایمان کی گواہی کیسے دے سکتا ہے کہ میں پکا اور کامل مؤمن ہوں؟! کیونکہ ان کے ہاں ایمان کے اجزاء ودرجات نہیں ہیں، چنانچہ جو ایسا کرتا ہے وہ ان کے نزدیک تزکیہ نفس جیسے قبیح وممنوع فعل کا مرتکب ہوتا ہے جو کہ حرام ہے، اس لئے اس حرام کام سے بچنے کے لئے استثناء واجب ہے، جبکہ حرمت کے قائلین نے اصل ایمان کے وجود کی گواہی کی حالت کو پیش نظر رکھا ہے، اس لئے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ کوئی شخص اپنے دل کے اندر "اصل الایمان" کے وجود کے بارے میں کیسے شک کر سکتا ہے؟ کیونکہ ان کے مطابق استثناء شک پر دلالت کرتا ہے اور اصل ایمان میں شک کرنا کفر ہے اس لئے اس کفر کے ارتکاب سے بچنے کے لئے استثناء حرام ہے۔

لیکن اہل السنہ نے مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر نتیجہ اخذ کیا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ استثناء نہ تو مطلقاً حرام ہے اور نہ ہی مطلقا واجب ہے بلکہ اپنے اصل کے اعتبار سے جائز ہے، لیکن اگر استثناء کرنے والا اپنے دل میں اصل ایمان کے وجود کے بارے میں مشکوک ہونے کی وجہ سے استثناء کرتا ہے تو اس کے لئے استثناء کرنا حرام ہے، اس لئے کہ ایمان کے وجود کے بارے میں شک کرنا جائز نہیں ہے اور جو چیز کسی حرام کام کا سبب بنے وہ بھی حرام ہے، لہٰذا اگر کسی کا مقصد ایمان کے وجود کے بارے میں شک کا اظہار کرنا ہو تو ایسا کرنا حرام ہے اور کرنے والا گنہگار ہے، لیکن اگر استثناء کرنے والا اپنے نفس سے تزکیہ کی نفی کرنے اور ریاکاری سے بچنے کے لئے استثناء کرتا ہے تو یہ واجب ہے، کیونکہ ریاکاری، خود پسندی اور غرور سے جان چھڑانا واجب ہے اور جس چیز کے بغیر کوئی واجب کام پورا نہ ہو وہ بھی واجب ہے، خلاصہ یہ ہے کہ استثناء کہنے کے پیچھے دل میں چھپے مقاصد کے اعتبار سے حکم بدلتا ہے، چنانچہ اگر کوئی مشکوک ہونے کی وجہ سے ان شاء اللہ کہتا ہے تو اس کے لئے ایسا کرنا حرام ہے، اور اگر "میں مؤمن ہوں" کہتے ہوئے کسی کے دل میں غرور، خود پسندی اور تزکیہ نفس کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اس محذور سے بچنے کے لئے ان شاء اللہ کہتا ہے تو اس کے لئے ان شاء اللہ کہنا واجب ہے، اور اگر کسی کے دل میں اس طرح کا کوئی احساس پیدا نہیں ہوتا نہ ہی شک اور نہ ہی عجب وغرور تو اس کے لئے استثناء کرنا نہ کرنا دونوں جائز ہے چاہے تو کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے دونوں برابر ہے۔

۹-عذاب قبر کے مسئلہ میں وسطیت کہ وہ روح پر ہو گا یا بدن پر:

بعض لوگ کہتے ہیں جن میں ابن حزم بھی ہیں کہ عذاب قبر صرف روح پر ہو گا، اس کے بر عکس بعض دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ عذاب قبر صرف بدن پر ہو گا، جبکہ اہل السنہ والجماعہ وسطیت واعتدال کی راہ اپناتے ہوئے کہتے ہیں کہ عذابِ قبر روح اور بدن دونوں پر ہو گا، اس کی کیا کیفیت ہو گی یہ اللہ ہی کو معلوم ہے اور وہی اس کا فیصلہ کرے گا، ہم نہ تو تاویل کریں گے نہ ہی انکار کریں اور نہ اپنی طرف سے کسی بات کا اضافہ کریں گے، بلکہ وہی کہیں گے جو نصوص نے بیان کیا ہے اور ان امور پر سکوت اختیار کریں گے جن کے تعلق سے کتاب وسنت خاموش ہے، پس اہل السنہ کا یہ عقیدہ ہے کہ عذابِ قبر روح اور جسم دونوں پر ہو گا البتہ اصل روح پر ہو گا جسم اس کے تابع ہو گی، کیونکہ عوالم تین ہیں: ایک: دنیا جس میں عذاب در اصل جسم پر ہوتا ہے اور روح اس کے تابع ہوتی ہے، دوسرا: برزخ جس میں عذاب اصلا روح پر ہوتا ہے اور جسم اس کے تابع ہوتی ہے، اور تیسرا: آخرت جس میں عذاب روح اور بدن دونوں پر برابر ہو گا نہ کم نہ زیادہ، یہ اہل السنہ والجماعہ کا عقیدہ ہے جس پر نصوص شریعت دلالت کرتے ہیں جو کہ عقائد کی کتابوں میں بالتفصیل مذکور ہیں۔

۱۰- تکفیر معین کے مسئلہ میں وسطیت:

بعض لوگ جن میں خوارج، جماعۃ التکفیر والہجرۃ اور بالخصوص حکام کی تکفیر کے باب میں خوارج العصر اخوان المسلمین وغیرہم ہیں، یہ لوگ اپنے خود ساختہ قواعد وضوابط کی روشنی میں شروط وموانع کی پاسداری کے بغیر تعیین کے ساتھ گنہگار مسلمانوں اور مخالف افکار و نظریات کے حامل مؤمنوں کو کافر قرار دیتے ہیں، اور خواہش پرستی اور تعصب کی بنیاد پر لوگوں کی نیتوں میں گھس کر اوہام وظنون کا سہارا لے کر بلا علم و دلیل اللہ کے بندوں کو دین سے خارج قرار دیتے ہیں، چنانچہ اگر کوئی ان کے باطل افکار کو قبول نہ کرے تو کہتے ہیں کہ اگر تم ہمارے ساتھ نہیں تو ہمارے دشمن ہو اور پھر اس کی تکفیر کر ڈالتے ہیں۔

اس کے بالمقابل ایک دوسرا گروہ ہے جن میں دور حاضر کے مسلم عقلانین، لبرلز اور غامدی فکر سے متاثر افراد وغیرہم ہیں، انہوں نے تکفیر معین کا دروازہ سرے سے بند کر رکھا ہے، ان کے نزدیک سوائے اس کے جسے بالتعین نصوص میں کافر کہا گیا ہے کسی بھی معین شخص کو ہر گز کافر نہیں قرار دیا جا سکتا، جو بھی شخص خود کو مسلمان کہتا ہے وہ مسلمان ہے خواہ اس کے اعمال کچھ بھی ہوں، کسی بھی عالم قاضی مفتی یا محکمہ کو اس کی تکفیر کا کوئی حق نہیں ہے، معین تکفیر صرف اللہ کا حق ہے، لہٰذا عمومی انداز میں صرف اقوال واعمال پر کفر کا فتویٰ لگایا جائے، جہاں تک اشخاص کی تکفیر کی بات ہے تو یہ قطعاً جائز نہیں ہے۔

جبکہ اہل الحدیث والسنہ کا موقف یہ ہے کہ ہم نہ تو تکفیر معین کا دروازہ مطلقاً کھلا چھوڑ دیتے ہیں کہ جو چاہے اور جس کی چاہے بلا کسی اصول وضابطے کے شتر بے مہار کی طرح تکفیر کرتا پھرے، اور نہ ہی مطلقاً بند کر دیتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا شرک وکفر کا ارتکاب کرلے اور ہم شروط کی موجودگی اور موانع کی معدومی کے باوجود اسے مؤمن ہی سمجھتے رہیں، بلکہ اس باب میں ہمارا ایک اہم اصول یہ ہے کہ "تکفیر عام تکفیر معین کو مستلزم نہیں ہے، اور کسی معین شخص پر کفر کا فتویٰ تبھی لگے گا جب تکفیر کے شروط پورے ہوں گے اور کوئی مانع نہیں ہوگا" چنانچہ اگر کوئی مخصوص شخص کسی کفریہ قول یا فعل کا ارتکاب کرتا ہے تو ہم یہ تحقیق کرلینے کے بعد کہ واقعی اس نے یہ فعل انجام دیا ہے، اس پر دو طرح سے غور کرتے ہیں، اول تو یہ دیکھتے ہیں کہ آیا وہ قول یا فعل واقعی دین سے خارج قرار دینے والا کفر ہے یا نہیں، اگر حقیقت میں وہ کفر ہوتا ہے تو دلائل کی روشنی میں اس پر کفر کا حکم لگاتے ہیں، اس کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ کیا اس کا قائل یا فاعل اس عمل کی بنیاد پر تکفیر کا مستحق ہے یا نہیں اور اس کے لئے ہم اسے تکفیر کے شروط وموانع کے میزان پر تولتے ہیں، اگر تو اس کے اندر تکفیر کے تمام شروط پائے جاتے ہیں اور کوئی ایک بھی مانع نہیں ہوتا ہے تو اس کی تکفیر کرتے ہیں لیکن اگر کوئی ایک بھی شرط مفقود ہوتا اور کوئی ایک مانع موجود ہوتا ہے تو اس کی تکفیر سے احتراز کرتے ہیں، اور یہ تکفیر معین کا فیصلہ علمائے راسخین اور مخصوص قضاۃ ومفتیان کرام کے ذمے ہوتا ہے ہر کس وناکس اور طلبہ علم کو اس کا اختیار نہیں ہوتا کیونکہ یہ بڑا سنگین اور انتہائی خطرناک معاملہ ہے۔

تکفیر معین کے شروط: بندہ عاقل ہو، اسے معلوم ہو کہ یہ قول عمل یا اعتقاد تکفیر کا موجب ہے، اس نے اپنی مرضی اور اختیار سے اس فعل کا ارتکاب کیا ہو، اس نے قصد وارادے کے ساتھ جان بوجھ کر اس طرح کی حرکت کی ہو، وہ بالغ ہو، اور بغیر کسی تاویل کے کفریہ کام کرے۔

موانع تکفیر: جو کہ در اصل شروط تکفیر کے مخالف امور ہیں: یعنی وہ بندہ مجنون وپاگل ہو اس کی عقل صحیح سالم نہ ہو، اسے معلوم نہ ہو کہ یہ عمل کفر ہے بلکہ اس نے جہالت کی بنیاد پر اس کا ارتکاب کیا ہو، وہ مجبور ہو، بغیر قصد وارادے کے اس سے یہ حرکت سرزد ہوگئی ہو مثال کے طور پر کوئی انتہائی خوشی یا بیحد غصے کے عالم میں کوئی کفریہ کلمہ کہہ دے، وہ بندہ نابالغ یعنی بچہ ہو، یا اس نے کسی مناسب تاویل کی بنیاد پر اسے درست سمجھتے ہوئے اس کا ارتکاب کیا ہو۔

۱۱- معانی صفات کے معلوم یا مجہول ہونے کے مسئلہ میں وسطیت:

اہل قبلہ میں سے ایک گروہ جنہیں "مفوضہ" کہا جاتا ہے، جن میں اشاعرہ اور بعض ماتریہ بھی ہیں کہتے ہیں کہ نصوص الصفات یعنی صفات باری تعالیٰ پر مشتمل آیات واحادیث کے معانی نامعلوم وغیر مفہوم ہیں، اس لئے ہمیں نصوص میں وارد صفات کے معانی معلوم نہیں ہیں، یہ "مفوضہ اور اہل التجہیل" ہیں، واضح رہے کہ صفات کے باب میں اشاعرہ کا دو مسلک ہے: **ایک:** تاویل جس پر ان کی اکثریت ہے۔ **دوسرا:** تفویض جس پر چلنے والے بہت کم لوگ ہیں، ماتریدیہ میں بھی کچھ لوگ اس فکر کے قائل ہیں کہ یا تو تاویل کی جائے یا تفویض، جبکہ ان سب کے نزدیک تاویل احکم وافضل ہے کیونکہ ان کے مطابق یہ تنزیہ ہے جبکہ تفویض اسلم ہے، عہد قریب میں ماتریدیہ کے امام معطّل وجہمی زاہد کوثری نے بھی اسی طرح کی بات کی ہے یعنی آپ کو اختیار ہے یا تو تاویل کا مسلک اختیار کریں یا تفویض کا۔

ان مفوضہ کے نزدیک تفویض کا مطلب تفویض المعنی والکیفیہ دونوں ہیں، یعنی نصوص صفات کے معنی ومفہوم اور ان صفات کی کیفیات دونوں کا علم اللہ کے حوالے کر دیا جائے، چنانچہ وہ یہ کہتے ہیں کہ جس طرح ایک عامی عجمی انسان قرآنی آیات کی تلاوت کر کے کچھ نہیں سمجھتا بعینہ اسی طرح ہم بھی نصوص الصفات سے کچھ نہیں سمجھتے، یہ ایسا اس لئے کہتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک ان نصوص سے تشبیہ کے علاوہ کچھ سمجھ نہیں آتا لہٰذا اگر معنی بیان کریں گے تو تشبیہ لازم آئے گی جو کہ کفر ہے، اور وہ بعض سلف کا قول "أمروها كما جاءت" سے استدلال کرتے ہوئے اسے سلف کا مذہب قرار دیتے ہیں، اسی لئے شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ معطلہ خواہ وہ جہمیہ ہوں معتزلہ ہوں یا اشاعرہ وماتریہ یہ مشبہ سے زیادہ خطرناک ہیں کیونکہ یہ پہلے تو تشبیہ سوچ لیتے ہیں پھر اس کے بعد تنزیہ کے نام پر تاویل وتحریف کرتے ہیں، شیخ الاسلام نے مفوضہ کے مسلک کے بارے میں لکھا ہے "إن قول أهل التفويض من شر أقوال أهل البدع والإلحاد" کہ مفوضہ کا قول اہل بدعت والحاد کا سب سے بدترین قول ہے۔

اس کے بالمقابل ایک دوسرا گروہ ہے جنہیں "ممثلہ ومشبہ" کہا جاتا ہے جو نصوصِ صفات کے معانی کے ساتھ ساتھ کیفیات کی معرفت کا بھی دعویٰ کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ "اللہ کی صفات ہماری صفتوں کی طرح ہیں" اور کیفیت کے بارے میں بات کرنے سے ذرا برابر بھی نہیں ہچکچاتے، ان کے ہاں معرفت کے دعویٰ میں افراط اور مبالغہ آرائی ہے، جبکہ پہلے گروہ کے ہاں جہالت کے اقرار میں غلو وتطرف ہے۔

لیکن اہل الحدیث والسنہ اہل وسطیت واعتدال افراط وتفریط سے پاک صراط مستقیم پر گامزن ہیں، جو کہتے ہیں کہ ہمیں نصوص الصفات کے معانی معلوم ہیں لیکن ہم کیفیات سے ناواقف ہیں، جیسا کہ امام مالک وغیرہ نے فرمایا ہے: "الاستواء غير مجهول والكيف غير معقول والإيمان به واجب والسؤال عنه بدعة"(۱) کہ استواء کا معنی غیر مجہول یعنی معلوم ہے، اس کی کیفیت غیر معقول ہے، اس پر ایمان رکھنا واجب ہے اور اس کی کیفیت کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے، یہ عبارت اللہ تعالیٰ کے تمام صفات کے بارے میں اہل السنہ والجماعہ کا متفقہ اصول ہے کہ صفات کے معانی معلوم ہیں ان کی کیفیات نامعلوم ہیں ان پر ایمان لانا واجب ہے اور ان کی کیفیات کے بارے میں غور وخوض کرنا بدعت وضلالت ہے، چنانچہ اہل السنہ نہ تو دعوائے معرفت میں غلو وافراط سے کام لیتے ہیں کہ کیفیت کی معرفت کا دعویٰ کر بیٹھے اور نہ ہی تفریط کا مظاہرہ کرتے ہوئے دعوائے جہالت میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں کہ معانی کے علم کی بھی نفی کر دے، بلکہ دونوں گروہوں کے پاس جو حق ہے اسے لے لیتے ہیں اور جو باطل ہے اسے ترک کر دیتے ہیں، یعنی ہم نصوص الصفات کے معانی سمجھتے ہیں اور ان معانی کو اللہ کے لئے ثابت کرتے ہیں لیکن ان صفات کی کیا کیفیت ہے اس کا علم اللہ کے حوالے کر دیتے ہیں۔

۱۲-حکام کے ساتھ تعامل کے باب میں وسطیت:

امت میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو حکمرانوں کے ہاتھوں کھلونا بن جاتے ہیں، ان کی قدموں میں لیٹ جاتے ہیں، ان کے تابع فرمان غلام بن جاتے ہیں، جو ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور ان کی نا میں نا کرتے ہیں، حکمران انہیں جیسے چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں اور جو بھی غلط کام چاہتے ہیں ان سے کرواتے ہیں، معروف اور منکر کی تفریق کے بغیر یہ ان کی مطلق اطاعت کرتے ہیں، حکام کے جھوٹ ان کے لئے سچ اور حکام کے گناہ ان کے سامنے ثواب کی مانند ہوتے ہیں، یہ لوگ حکام کو مرفوع القلم سمجھتے ہیں نہ انہیں نصیحت کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے خلاف شرع کاموں سے نفرت کرتے ہیں، بلکہ وہ حکمرانوں کے ہر غلط کام کا جواز فراہم کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، چکنی چپڑی باتوں اور تملق بازی وچاپلوسی کے ذریعے ہمیشہ حکمرانوں سے قربت بڑھانے کی فراق میں رہتے ہیں، ایسے لوگ انتہائی بدترین مخلوق ہیں، یہی حکمرانوں کے بگاڑ کے اسباب ہوتے ہیں، ان کے سامنے فقط دنیا اور متاع دنیا ہوتی ہے، اور یہ خواہش کے پجاری ہوتے ہیں اللہ امت کو ایسے لوگوں سے پاک کرے آمین!

(۱)(رسالة "الأثر المشهور عن الإمام مالك في صفة الاستواء" للشيخ عبد الرزاق البدر)۔

جبکہ اس کے بالمقابل ایک گروہ خوارج واخوان کا ہے جو "اطاعت ولی الامر" والی احادیث سے گدھوں کی طرح بدکتے اور بھاگتے ہیں، حکمرانوں کے خلاف خروج وبغاوت کرتے ہیں، اور منبر ومحراب پر ہمیشہ ان کے خلاف آگ اگلتے اور زہر برساتے ہیں، اور ان کی مخالفت وعداوت اور لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکانے کو دین وایمان اور جہاد سمجھتے ہیں، نہ کسی سلطان کی عزت کرتے ہیں، نہ ان کی اطاعت کرتے ہیں اور نہ ہی ان کی بات سنتے ہیں بلکہ جب بھی موقع ملتا ہے ان کے خلاف ہتھیار اٹھا کر تختہ پلٹ دیتے ہیں حکمران کا قتل کر ڈالتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، ان کے مذہب کی بنیاد ہی بغاوت خوں ریزی لوٹ مار اور فتنہ وفساد پر ہے، یہ جہنم کے کتے ہیں اور دنیا کی سب سے بدترین مخلوق ہیں۔

ان سب کے برخلاف اہل الحدیث والسنہ نہ تو مطلق اطاعت کی بات کرتے ہیں اور نہ ہی مطلق معصیت اور خروج وبغاوت کی بات کرتے ہیں بلکہ نیکی اور معروف کے کاموں میں ولی الامر کی اطاعت واجب سمجھتے ہیں خواہ حاکم کا حکم پسند ہو یا نا پسند جب تک حرام کام کا حکم نہ دے اس کی اطاعت واجب سمجھتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَأَطِيعُواْ ٱلرَّسُولَ وَأُوْلِي ٱلۡأَمۡرِ مِنكُمۡ﴾(۱) جبکہ معصیت کے کاموں میں ولی الامر کی اطاعت حرام سمجھتے ہیں کیوں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے {لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق} کہ خالق کی نافرمانی کرتے ہوئے کسی بھی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔

نیز وہ یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ مسلمان حاکم کے خلاف قولی یا فعلی مسلح یا غیر مسلح کسی بھی قسم کی بغاوت جائز نہیں ہے، کیونکہ قولی بغاوت فعلی بغاوت کا وسیلہ ہے اور سد ذریعہ شرعاً مطلوب ومقصود ہے، اسی طرح عوام کے سامنے ان کی برائیاں بیان کرنا اور ان پر علانیہ رد وتنقید کرنا بھی جائز نہیں ہے، ہاں اگر حاکم وقت معصیت کا ارتکاب کرتا ہو اور اس کی حکومت میں ظلم ناانصافی اور خلاف شرع کام ہو رہے ہوں تو تنہائی میں یا ڈائریکٹ اس کے سامنے جاکر ان غلط کاموں پر حتی المقدور نکیر کرنا اور اسے نصیحت کرنا بھی اہل علم وفضل پر واجب سمجھتے ہیں۔

اور صرف اسی صورت میں خروج وبغاوت جائز سمجھتے ہیں کہ حاکم صریح کفر کا ارتکاب کرے، اور اس عمل کے کفر ہونے پر کتاب وسنت کی واضح دلیل موجود ہو، اور یقینی وقطعی ذرائع سے تصدیق حاصل ہو کہ حاکم نے واقعی اس کفر کا ارتکاب

---

(۱)(النساء۵۹)۔

کیاہے، نیز غالب گمان ہو کہ بغیر خون بہائے اس پر غلبہ ممکن ہے اور اس حاکم سے بہتر کوئی دوسرا حکمرانی کا اہل شخص موجود ہے۔

نیز اہل السنہ والحدیث ہر مسلمان حاکم کی اقتداء میں حج جہاد جمعہ اور جماعت کی ادائیگی واجب سمجھتے ہیں خواہ وہ نیک ہو یا فاسق وفاجر، جو کوئی بھی کسی فاسق وفاجر امام کی اقتدا میں نماز نہیں پڑھتا اور الگ جماعت قائم کرتا ہے یا اکیلے نماز پڑھتا ہے وہ بدعت کا داعی اور سنت سے دور ہے۔

۱۳-رجاء اور خوف کے مسئلہ میں وسطیت:

اس مسئلہ میں لوگوں کی تین قسمیں ہیں: کچھ لوگ جن میں مرجئہ بھی ہیں رجاء یعنی امید کے پہلو کو غلبہ دیتے ہوئے عبادت کرتے ہیں، چنانچہ یہ لوگ رحمت ومغفرت اور جنت ونعمت سے متعلق وعدہ ربانی پر مشتمل نصوص کو فوقیت دیتے ہیں اور رجائیت کا شکار ہو کر اللہ کی پکڑ اور عذاب سے بے پرواگناہ کرتے جاتے ہیں، کیونکہ انہیں یہ امید ہے کہ اللہ غفور ورحیم ہے اس لئے وہ جو بھی اور جتنا بھی گناہ کریں اللہ انہیں معاف کر دے گا، یہ انتہائی باطل عقیدہ ہے جس کا انجام بڑا سنگین اور خطرناک ہے۔

اس کے برعکس کچھ لوگ اللہ کی رحمت ومغفرت سے غافل ہو کر صرف اور صرف خوف کی بنیاد پر اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اور وعید سے متعلق نصوص کو فوقیت دیتے ہیں اور وعدہ ورحمت سے متعلق نصوص سے بے اعتنائی برتتے ہیں، چنانچہ یہ اللہ کی رحمت سے مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں جو کہ کفر ہے، یہ وعیدیہ خوارج ومعتزلہ ہیں، انہوں نے افراط ومبالغہ آرائی اور شدت پسندی کا مظاہرہ کیاہے، جبکہ پہلے گروہ نے تفریط وتساہل سے کام لیاہے۔

لیکن اہل السنہ والحدیث وسطیت کی راہ پر گامزن ہیں چنانچہ وہ خوف اور رجاء دونوں کے ذریعے عبادت کرتے ہیں اور اپنی عبادت کی بنیاد دونوں پر رکھتے ہیں، چنانچہ اللہ کے عذاب سے ڈرتے بھی ہیں اور اس کی رحمت ومغفرت کی امید بھی رکھتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی صفت بیان فرمائی ہے ﴿ويدعوننا رغبا ورهبا﴾[1] کہ وہ ہمیں رغبت یعنی ثواب ونعمت کی

---

(۱)(الأنبیاء۹۰)۔

امید اور رہبت یعنی خوف کے ساتھ پکارتے ہیں، نیز فرمایا﴿ادعوا ربك تضرعا وخفية إنه لا يحب المعتدين﴾(۱) ﴿أَمَّنْ هُوَ قَٰنِتٌ ءَانَآءَ ٱلَّيْلِ سَاجِدًا وَقَآئِمًا يَحْذَرُ ٱلْـَٔاخِرَةَ وَيَرْجُواْ رَحْمَةَ رَبِّهِۦ﴾(۲) پس اہل السنہ اپنی عبادت میں خوف ورجاء اور رغبت ورہبت دونوں کو جمع کرتے ہیں جس سے خشیت پیدا ہوتی ہے، کیونکہ جو اللہ کی عبادت فقط رجاء کی بنیاد پر کرتا وہ اللہ کے مکر سے مامون وبے خوف ہو جاتا ہے﴿أَفَأَمِنُواْ مَكْرَ ٱللَّهِۚ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ ٱللَّهِ إِلَّا ٱلْقَوْمُ ٱلْخَٰسِرُونَ﴾(۳) اور جو اللہ کی عبادت فقط خوف کی بنیاد پر کرتا ہے وہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جاتا ہے﴿وَلَا تَاْيْـَٔسُواْ مِن رَّوْحِ ٱللَّهِۖ إِنَّهُۥ لَا يَاْيْـَٔسُ مِن رَّوْحِ ٱللَّهِ إِلَّا ٱلْقَوْمُ ٱلْكَٰفِرُونَ﴾(۴) اور جو اللہ کی عبادت ان دونوں کے ذریعے کرتا ہے وہی سچا موحد اور پکا مومن ہے، کیونکہ خوف ورجاء عبادت کے لئے پرندہ کے دو بازوؤں کی مانند ہے اور یہ بدیہی ہے کہ پرندہ ایک بازو کے ذریعے نہیں اڑ سکتا!

لہٰذا اصل یہی ہے کہ خوف ورجاء دونوں برابر ہوں، البتہ اگر اسباب ومقتضیات موجود ہوں تو بعض صورتوں میں کسی ایک کو غلبہ دینا بھی جائز ہے، چنانچہ بیماری کی حالت میں، موت کے وقت، مصیبت وپریشانی کے عالم میں، اسی طرح گناہوں سے توبہ کے موقع پر "رجاء" یعنی امید کو غلبہ دیا جائے گا تاکہ اللہ کی رحمت سے مایوسی نہ ہو، جبکہ تندرستی اور مالداری کی حالت میں اسی طرح گناہ میں ملوث ہونے کے اندشیہ کے وقت خوف کو غلبہ دیا جائے گا تاکہ عجب وکبر سے محفوظ رہے اور گناہوں میں واقع نہ ہو نیز اللہ کی پکڑ سے غافل نہ ہو جائے۔

۱۴- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کے مسئلہ میں وسطیت:

امت کے بہت سارے لوگ جن میں صوفیہ اور قبر پرست بریلویہ وغیرہ فرقے شامل ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بیحد افراط اور مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں، چنانچہ آپ کو الٰہی صفات سے متصف کر کے مقام ربوبیت پر فائز کر دیتے

---

(۱)(الأعراف ۵۵)۔

(۲)(الزمر ۹)۔

(۳)(الأعراف ۹۹)۔

(۴)(یوسف ۸۷)۔

ہیں، آپ کی بشریت کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نور ہیں جسے اللہ کے نور سے پیدا کیا گیا ہے، آپ سے مدد طلب کرتے ہیں، مصیبت کے وقت آپ کو پکارتے ہیں، آپ سے اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے فریاد کرتے ہیں، اولاد مانگتے ہیں، شفا چاہتے ہیں، آپ کو عالم الغیب سمجھتے ہیں، آپ کے سایہ ہونے کا انکار کرتے ہیں، بلکہ یہاں تک کہہ ڈالتے ہیں کہ "وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر اتر آیا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر" نیز کہتے ہیں کہ اگر آپ نہ ہوتے تو یہ کائنات نہ ہوتی، آپ ہی کے نور سے مخلوقات کی تخلیق ہوئی ہے وغیرہ وغیرہ خرافات۔

اس کے بالمقابل کچھ روافض اور غالی قسم کے صوفیہ وغیرہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہیں اور آپ کی تنقیص وتوہین کرتے ہیں، چنانچہ روافض کا عقیدہ ہے کہ ائمہ اہل بیت کا مقام ومرتبہ انبیاء ورسل اور فرشتوں سے بالاتر ہے، اسی طرح صوفیہ کا عقیدہ ہے کہ ان کے اولیاء انبیاء ورسل سے افضل اور ان سے زیادہ علم والے ہیں، کسی بڑے صوفی نے کہا ہے کہ "اے انبیاء کی جماعت اللہ نے تمہیں نبوت کا لقب عطا کیا ہے جبکہ ہمیں وہ کچھ دیا گیا ہے جو تمہیں نصیب نہیں ہوا ہے" ابویزید بسطامی نے کہا کہ "اللہ کی قسم میرا جھنڈا محمد کے جھنڈے سے کہیں بڑا ہے، میرا جھنڈا نور سے بنا ہے" اسی طرح کسی نے کہا "برزخ میں نبی کا مقام رسول سے تھوڑا اوپر اور ولی سے نیچے ہے"۔(۱) اسی مقصد سے بعض صوفیوں نے "خاتم الأنبیاء" کے بالمقابل "خاتم الأولیاء" کی اصطلاح ایجاد کی ہے اور خاتم الاولیاء کو نبیوں سے افضل قرار دیا ہے۔

جبکہ اہل السنہ والجماعہ کا عقیدہ یہ ہے کہ آپ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، آپ سید الخلق اور افضل الرسل ہیں، آپ سے محبت دین ایمان اور احسان ہے، آپ کی اطاعت تعظیم وتوقیر اور آپ کی سنت کی اتباع ایمان کا رکن اور حتمی فریضہ ہے، آپ خاتم النبیین ہیں، آپ عالم الغیب نہ تھے نہ اپنی زندگی میں اور نہ مرنے کے بعد سوائے ان مخفی امور کے جن کی خبر اللہ نے آپ کو دی تھی، آپ ایک انسان تھے جس کے پاس کوئی الٰہی صفت نہ تھی، نیز اہل السنہ آپ کی شان میں مبالغہ آرائی اور آپ کی تعریف وتوصیف میں غلو وافراط سے منع کرتے ہیں، آپ پر درود وسلام پڑھنا واجب سمجھتے ہیں، اور یہ یقین کامل رکھتے ہیں کہ آپ نے تبلیغ رسالت کا حق ادا کر دیا ہے اور اس میں کسی قسم کی کمی کوتاہی نہیں کی ہے۔

۱۵-اولیاء وصالحین کی تعظیم اور کرامات اولیاء کے باب میں وسطیت: اس باب میں اہل قبلہ کے تین گروہ ہیں:

---

(۱) (أنظر التصوف الإحسان إلی ظہیر ص:۱۸۸)۔

پہلا گروہ: روافض، غالی قسم کے صوفیہ اور قبر پرست بریلویہ کا ہے، جو بعض حقیقی صالحین کے علاوہ عام طور پر بدعات و خرافات کے ائمہ ودعات کو اولیاء اللہ اور صالحین سمجھتے ہیں، ان کی طرف غلو وافراط پر مبنی ناقابل یقین عجیب وغریب قسم کے کرامات وکمالات منسوب کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ انہیں کائنات کی تدبیر و تنظیم میں تصرف کی قدرت واختیار حاصل ہے، ان سے استغاثہ واستعانت کرتے ہیں، ان کی قبروں پر مساجد و مزارات تعمیر کرتے ہیں اور ان پر پھول چادر اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں، ان کا طواف کرتے ہیں، ان کی قبروں پر سجدہ کرتے ہیں اور فریادیں لے مزارات کی طرف رخت سفر باندھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا گروہ: معتزلہ وجہمیہ اور فلاسفہ کا ہے جو اولیاء وصالحین کی تنقیص کرتے ہیں، ان کی شان میں تفریط و تقصیر سے کام لیتے ہیں اور ان کے لئے جو فضائل ومناقب ثابت ہیں ان کا انکار کرتے ہیں، نیز ان سے کرامات کے وقوع وظہور کی بھی نفی کرتے ہیں کیونکہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ خوارق عادت امور کا ظہور صرف انبیاء ورسل کے ہاتھوں ہی ممکن ہے لہٰذا اگر غیر انبیاء ورسل کے ہاتھوں بھی خوارق عادت اشیاء کا ظہور ہو جائے تو معاملہ خلط ملط ہو جائے گا اور نبی غیر نبی کے درمیان تفریق مشکل ہو گی، اس لئے کہ نبی اور غیر نبی کے مابین فارق معجزہ ہے جو کہ خوارق عادت اشیاء میں سے ہوتا ہے۔

تیسرا گروہ: اہل الحدیث والسنہ کا ہے، جو اس بات کے قائل ہیں کہ صالح اور متقی مؤمنین ہی اولیاء اللہ ہیں، لہٰذا ان سے موالات ومحبت کرنا، ان کی تعریف کرنا، ان کی خوبیوں کا تذکرہ کرنا اور ان کے لئے دعائیں کرنا واجب ہے، اولیاء وصالحین گناہوں اور غلطیوں سے معصوم نہیں ہوتے، لہٰذا ان سے بھی وہ گناہیں اور غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں جو عام مسلمانوں سے ہوتی ہیں، نیز اہل السنہ اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ حقیقی اولیاء اللہ سے کرامات کا ظہور ہوتا ہے، اور اولیاء اللہ کی جو کرامات صحیح اسانید سے مروی ہیں ان کی تصدیق کرتے ہیں اور ان پر ایمان رکھتے ہیں، کسی بھی ولی اللہ کو کسی نبی یا رسول پر فضیلت نہیں دیتے ہیں، اور ان کی شان میں مبالغہ آرائی سے کام لینا اور انہیں کائنات کی تبدیر میں تصرف کا مجاز ومختار سمجھنا، ان کی قبروں پر مساجد ومزارات تعمیر کرنا اور ان کے لئے کسی بھی قسم کی عبادت انجام دینا قطعاً جائز نہیں سمجھتے ہیں۔

۱۶-اسباب کی تاثیر کے مسئلے میں وسطیت:

کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اسباب بذاتِ خود مؤثر ہیں، انہیں "مشركة الأسباب" کہا جاتا ہے، یہ توحید ربوبیت میں شرک کے مرتکب ہیں، کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ کے علاوہ کچھ دوسرے عناصر بھی تصرف کا اختیار رکھتے

ہیں، یہ اسی قسم کا عقیدہ ہے جو کہتا ہے کہ "ہامہ" اور "طیرہ" بذاتِ خود نقصان پہنچاتے ہیں، اور تمائم و تولہ اور جھاڑ پھونک بذاتِ خود نفع پہنچاتے ہیں، یہ سب ربوبیت میں شرک ہے، یہ لوگ "اسباب کے اثبات" میں غلو وافراط سے کام لیتے ہیں، ان کے اس موقف میں حق اور باطل دونوں ہیں، حق یہ ہے کہ یہ اسباب کے مؤثر ہونے کا اقرار کرتے ہیں، اور باطل یہ ہے کہ وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسباب کی یہ تاثیر ذاتی ہے، اللہ کی تقدیر کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

اس کے برعکس کچھ دوسرے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اسباب کی قطعاً کوئی تاثیر نہیں ہوتی ہے، بلکہ اثر سبب کے وجود کے وقت وجود پذیر ہوتا ہے نہ کہ سبب کے ذریعے، یہ جہمیہ کے کچھ گروہ ہیں جنہیں "معطلۃ الاسباب" کہا جاتا ہے، چنانچہ اگر آپ کسی شیشہ پر پتھر پھینکیں اور وہ ٹوٹ جائے تو ان کے نزدیک پتھر پھینکنے کا شیشہ ٹوٹنے میں ہرگز کوئی ہاتھ نہیں ہے اور نہ ہی اس کی کوئی تاثیر کارفرما ہے، بلکہ دراصل شیشہ خود بخود ٹوٹ جاتا گرچہ آپ پتھر نہ بھی پھینکتے، اسی طرح جب آپ کو بھوک لگتی ہے اور آپ کھانا کھا کر شکم سیر ہو جاتے ہیں تو ان کے مطابق یہ شکم سیری کھانے کی وجہ سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ کھانے کے وقت حاصل ہوتی ہے اس طور پر کہ پیٹ بھرنے میں کھانے کی کوئی تاثیر نہیں ہوتی بلکہ کھانے کے وقت پیٹ خود بخود بھر جاتا ہے، اس قول کی بارے میں شیخ ابن عثیمین فرماتے ہیں کہ یہ ایسا باطل اور احمقانہ بات ہے کہ اس سے بیوقوف لوگ بھی ہنستے ہیں۔

ان احمقوں کی رائے کے مطابق اگر کوئی شخص اپنے دشمن کو گولی مار کر قتل کر ڈالتا ہے اور وہ پکڑے جانے پر کہتا ہے کہ موت تو گولی لگنے کے وقت واقع ہوئی ہے، گولی اور گولی مارنے والے کا موت کے وقوع میں کوئی عمل دخل نہیں ہے، تو ان کے مسلک کے مطابق ملزم قتل کے جرم سے بری ہے، کیونکہ یہ لوگ اسباب کی تاثیر کے قائل نہیں ہیں۔

اسی طرح اگر کوئی ان میں کسی احمق کو تھپڑ رسید کر دے اور تھپڑ کھانے والا شخص کہے کہ تم نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے، اس پر تھپڑ مارنے والا کہے کہ تکلیف تو تھپڑ پڑنے کے وقت حاصل ہوئی نہ کہ تھپڑ کی وجہ سے کیونکہ اسباب تو غیر مؤثر ہیں تو کیا وہ یہ بات معقول سمجھ کر قبول کرے گا؟!

جبکہ اہل السنہ والحدیث کا وسطیت واعتدال پر مبنی موقف یہ ہے کہ اسباب مؤثر ہیں لیکن ان کی تاثیر بذاتِ خود نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے قضاء وقدر اور مشیت وحکم کے تابع ہے، وہی سبب اور اس کے اثر کو مربوط کرتا ہے اور وہی اس کو اثر سے جدا کرنے اور روکنے پر بھی قادر ہے، لہٰذا اگر اللہ چاہے تو سبب کی وجہ سے اس کی تاثیر پیدا کر دے اور اگر چاہے تو سبب کی

موجودگی کے باوجود اثر معدوم ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے معاملے میں آگ کو اس کی تحریق کی تاثیر سے الگ کر دیا تھا فرمایا﴿قُلۡنَا يَٰنَارُ كُونِي بَرۡدٗا وَسَلَٰمًا عَلَىٰٓ إِبۡرَٰهِيمَ﴾(۱) چنانچہ آگ کی موجودگی کے باوجود تحریق کا اثر نہیں پایا گیا، پس اہل السنہ نہ تو مطلقاً تاثیر کا انکار کرتے ہیں اور نہ ہی اسباب کو بذات خود مؤثر قرار دیتے ہیں، بلکہ وہ منکرین تاثیر کا رد کرتے ہوئے اسباب کو مؤثر مانتے ہیں اور "مشرکۃ الاسباب" کا رد کرتے ہوئے اس تاثیر کی استقلالیت کی نفی کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسباب اللہ کی قضاء وقدر اور مشیت وحکم سے مؤثر ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل الحدیث والسنہ دین وشریعت کے تمام ابواب ومسائل میں افراط وتفریط تشدد وتساہل اور غلو وجفاء سے پاک وسطیت اور اعتدال کی راہ پر گامزن ہیں اور ہر مسئلہ میں دلائل کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر تمام ادلہ کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا موقف متعین کرتے ہیں۔

تفصیلات کے لئے رجوع کریں:

(۱) رسالة في بيان وسطية أهل السنة في أبواب الاعتقاد، للشيخ وليد السعيدان-

(۲) وسطية أهل السنة بين الفرق، للدكتور محمد باكريم -

(۳) المختصر الحثيث في بيان أصول منهج السلف أصحاب الحديث، عيسى بن مال الله فرج-

---

(۱)(الأنبياء۶۹)۔

حافظ علیم الدین یوسف
جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ: فضیلت، خلافت اور روافض کے بعض شبہات (قسط چہارم)

کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کو "فلتہ" (اچانک واقع ہونے والی بیعت) قرار دیا ہے؟

اس کے جواب میں سب سے پہلے ہم اس لفظ کا معنی عربی زبان کی لغات میں دیکھتے ہیں۔ **"فلتہ"** عربی زبان میں "کسی کام کے اچانک واقع ہونے" کو کہا جاتا ہے۔[1]

علماے حدیث نے اس لفظ کی مختلف توجیہات کی ہیں اور ان تمام اقوال کا مقصود یہی ہے کہ لفظ فلتہ سے مراد وہ واقعات ہیں جو ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے قبل پیش آئے تھے۔ ذیل کے سطور میں اقوال سلف ملاحظہ فرمائیں:

- سالم بن عبد اللہ رحمہ اللہ لفظ "فلتہ" کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "الفلتة الليلة التي يشك فيها هل هي من رجب أو شعبان وهل من المحرم أو صفر كان العرب لا يشهرون السلاح في الأشهر الحرم فكان من له ثأر تربص فإذا جاءت تلك الليلة انتهز الفرصة من قبل أن يتحقق انسلاخ الشهر فيتمكن ممن يريد إيقاع الشر به وهو آمن فيترتب على ذلك الشر الكثير فشبه عمر الحياة النبوية بالشهر الحرام والفلتة بما وقع من أهل الردة ووقى الله شر ذلك ببيعة أبي بكر لما وقع منه من النهوض في قتالهم وإخماد شوكتهم كذا قال."

(سالم بن عبد اللہ رحمہ اللہ لفظ "فلتہ" کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: فلتہ؛ مہینے کی اس رات کو کہتے ہیں جس کے بارے میں شک ہو کہ یہ رجب کی رات ہے یا شعبان کی، اور محرم کی رات ہے یا صفر کی۔ اہل عرب حرمت والے مہینوں میں جنگ وجدل سے احتراز کرتے تھے، چنانچہ جسے کسی سے کوئی انتقام لینا ہوتا وہ انتظار کرتا یہاں تک کہ

---

[1] الصحاح تاج اللغۃ وصحاح العربیۃ: (۲۶۰/۱).

جب حرمت والے مہینہ کی آخری تاریخ کو مہینے کے اختتام سے قبل ہی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حالت امن (حرمت والے مہینے) میں ہی دشمن پر حملہ آور ہو جاتے، اس کی وجہ سے بہت زیادہ شر اور فساد کا ماحول گرم ہو جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اس جملے میں حیات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حرمت والے مہینوں سے تعبیر کیا اور لفظ "فلتة" سے اہل الردہ کے ارتداد کو مراد لیا ہے، اور ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالنے کے بعد اہل ردہ سے قتال اور ان کی قوت وشوکت ختم کرنے کا جو کار عظیم آپ نے انجام دیا اس کی وجہ سے اللہ رب العالمین نے مسلمانوں کو ان (اہل ردہ) کے شر سے محفوظ رکھا۔)[1]

سالم بن عبد اللہ رحمہ اللہ کی تفسیر کے مطابق "فلتة" سے مراد حرمت والے مہینے کی آخری رات میں وقوع پذیر ہونے والی شر انگیزیاں ہیں، واضح رہے کہ بذات خود وہ رات بری نہیں تھی بلکہ اس میں بعض لوگ شر انگیزی والا کام کرتے تھے، چنانچہ اس رات کی طرف فعل کی نسبت ہونے کے سبب اسے شر کی صفت سے متصف کیا گیا۔ یہی معاملہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیعت ابو بکر کو "فلتة" سے تعبیر نہیں کیا، بلکہ بیعت سے قبل ابتدائی طور پر جو اختلاف سامنے آیا اسے اور بیعت کے بعد اہل ارتداد کے معاملے کو "فلتة" سے تعبیر کیا، اور چونکہ یہ تمام واقعات ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے قبل یا بعد میں پیش آئے تھے، لہذا فعل کی نسبت زمانہ وقوع کی طرف کر دی۔ اس تفسیر کی دلیل اسی حدیث میں موجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے: "وإنا والله ما وجدنا فيما حضرنا من أمر أقوى من مبايعة أبي بكر"۔[2] (ہم نے واللہ اس مجلس میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے زیادہ بہتر کوئی دوسری شے نہیں پائی۔) صحیح ابن حبان کی روایت میں "أقوى" کی جگہ "أفضل" کا لفظ وارد ہوا ہے۔[3]

قارئین کرام: غور فرمائیں کہ مذکورہ جملے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود اس بیعت کو "قوی امر" اور "بہترین امر" سے تعبیر کیا، لہذا یہ بعید از عقل ہے کہ جس امر کو آپ نے خود "بہترین امر" قرار دیا اسے خود ہی "شر" والی بیعت قرار دیں۔

---

۱ فتح الباری لابن حجر: (۱۲/۱۴۹).

۲ صحیح البخاری (۶۸۳۰).

۳ صحیح ابن حبان – محققا: (۴۱۳)۔

- امام داودی رحمہ اللہ اس لفظ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "**معنى قوله كانت فلتة** أنها وقعت من غير مشورة مع جميع من كان ينبغي أن يشاور."

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کو "فلتہ" سے تعبیر اس لئے کیا کیوں کہ بیعت کے وقت وہ تمام صحابہ کرام موجود نہیں تھے جو اہل شوری میں سے تھے۔)[۱]

اس تفسیر کے مطابق بعض اہل شوری کے اس بیعت میں شامل نہ ہونے کے سبب اس بیعت کو "فلتہ" سے تعبیر کیا گیا، گویا یہ بیعت ان کے لئے اچانک منعقد ہونے والی بیعت تھی جو اس مشورہ میں شامل نہیں ہو سکے تھے، بذات خود بیعت اچانک منعقد نہیں ہوئی تھی، بلکہ انصار ومہاجرین کے درمیان کچھ باتیں ہوئیں، طرفین کی جانب سے دلائل کا تبادلہ ہوا، مگر جب انصار کو علم ہوا کہ امر خلافت صرف قریش کا حق ہے تو وہ فوراہی دعوائے خلافت سے دستبردار ہو گئے، بعد ازاں عمر رضی اللہ عنہ کے پیش کئے دلائل کی بنیاد پر اہل سقیفہ نے متفقہ طور پر ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ تسلیم کر لیا۔

کیا ان تمام امور کے باوجود کوئی عاقل اس بیعت کو بلا مشورہ اور اچانک کی بیعت سے تعبیر کرے گا؟ جواب یقینا نفی میں ہو گا۔ خود حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ صحابہ کرام کے مشورہ سے ہی بیعت واقع ہوئی تھی، حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کا یہ قول ملاحظہ فرمائیں، فرماتے ہیں: "ما غضبنا إلا لأنا قد أخرنا عن المشاورة." (ہمارے ناراض ہونے کا سبب یہ ہے کہ ہمیں مشورے میں شامل نہیں کیا گیا)۔[۲] گویا انہوں نے یہ اقرار کیا کہ اس بیعت میں مشورہ کیا گیا تھا، البتہ دونوں جلیل القدر صحابہ کرام مشورہ میں شامل نہیں ہو سکے تھے۔[۳]

---

۱ فتح الباری لابن حجر: (۱۴۹/۱۲).

۲ المستدرک علی الصحیحین للحاکم: (۴۴۲۲).

۳ یہاں یہ سوال کسی کے ذہن میں پیدا ہو سکتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشورے کے وقت کیوں نہیں بلایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مختلف مقامات پر جمع ہوئے، مہاجرین کی اکثریت ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ جمع تھی جبکہ حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں موجود تھے، اسی اثنا میں خبر آئی کہ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں خلیفہ کے انتخاب کے لئے جمع ہیں، یہ سنتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو ساتھ لیا اور فورا سقیفہ پہنچ گئے۔ لہذا فتنہ ہونے کے خوف سے انہوں نے عجلت میں صرف اپنے ساتھ موجود صحابہ کو ساتھ لیا، جیسا کہ صحیح بخاری اور احادیث کی دیگر کتابوں میں صحیح سند کے ساتھ مذکور ہے۔ صحیح البخاری (۶۸۳۰)، مسند أحمد شاکر: (۳۹۱).

- امام کرابیسی الشافعی فرماتے ہیں: "بل المراد أن أبا بكر ومن معه تفلتوا في ذهابهم إلى الأنصار فبايعوا أبا بكر بحضرتهم وفيهم من لا يعرف ما يجب عليه من بيعته فقال منا أمير ومنكم أمير فالمراد بالفلتة ما وقع من مخالفة الأنصار وما أرادوه من مبايعة سعد بن عبادة."

(اس سے مراد یہ ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ جو دوسرے صحابہ تھے وہ اچانک ہی انصار کے پاس پہنچ گئے، پھر سقیفہ میں موجود تمام حاضرین نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ سقیفہ میں بعض ایسے بھی تھے جنہیں بیعت کے واجبات وشرائط کا بھی علم نہیں تھا، چنانچہ کسی نے کہا: ہمارے قبیلے سے ایک امیر ہو گا اور آپ کے قبیلے سے ایک۔ لہذا "فلتۃ" سے مراد انصار کی مخالفت اور ان کا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کا ارادہ کرنا تھا۔)[1]

- ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "معنى قوله كانت فلتة أن ابتداءها كان عن غير ملإ كثير والشيء إذا كان كذلك يقال له الفلتة فيتوقع فيه ما لعله يحدث من الشر بمخالفة من يخالف في ذلك عادة فكفى الله المسلمين الشر المتوقع في ذلك عادة لا أن بيعة أبي بكر كان فيها شر".

(ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فلتۃ" سے مراد یہ ہے کہ ابتدائی بیعت میں لوگ کثیر تعداد میں موجود نہیں تھے، اور جب کوئی معاملہ اس طرح معرض وجود میں آئے تو اسے "فلتۃ" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور عموما ایسی صورت میں بعض لوگوں کی مخالفت کے سبب شر پھیلنے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے، مگر اللہ رب العالمین نے اس متوقع شر سے مسلمانوں کو محفوظ رکھا، اس سے یہ مفہوم لینا غلط ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے سبب شر پھیلنے کا اندیشہ تھا۔)

- بعض علما فرماتے ہیں: "**كانت فلتة**؛ لأنه لم يكن في أول الأمر جميع خواص الصحابة، ولا عوامّهم."

(اس بیعت کو "فلتۃ" سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ ابتدائی بیعت میں تمام کبار وصغار صحابہ کرام شریک نہیں ہو سکے تھے۔)[2]

مذکورہ تمام اقوال کا خلاصہ یہی ہے کہ بیعت ابو بکر ایک بہترین امر تھا، اس بیعت کو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے بغیر کسی اختلاف کے قبول کیا اور بیعت مشورہ کے بعد منعقد ہوئی تھی، جہاں تک لفظ "فلتۃ" کا معاملہ ہے تو اس سے

۱فتح الباری لابن حجر: (۱۴۹/۱۲)۔

۲اللامع الصبیح بشرح الجامع الصحیح: (۳۲۵/۱۶)۔

مراد ابو بکرؓ کی بیعت سے قبل پیش آمدہ واقعات ہیں یا پھر ان کے عہد میں رونما ہونے والے فتنے ہیں جن کا انہوں نے بڑی قوت کے ساتھ مقابلہ کیا اور انہیں ان کے انجام تک پہنچایا۔

قارئین کرام: حضرت عمرؓ کے خطبے میں وارد لفظ "فلتہ" سے دلیل اخذ کرنے والے جب اس حدیث پر گفتگو کرتے ہیں تو صرف اس ایک لفظ پر گفتگو کرتے ہیں، حدیث کے بقیہ الفاظ پر گفتگو کرنے سے وہ کتراتے ہیں، کیوں کہ انہیں علم ہے کہ پوری حدیث عوام کے سامنے پیش کرنا ان کے فاسد عقیدے کا کھوکھلا پن واضح واضح کر دے گا۔ ذیل کے سطور میں حدیث کے چند اہم جملے اور ان کی توضیحات آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

1 - حضرت عمرؓ کو یہ خدشہ تھا کہ کچھ لوگ میری بات کا غلط مفہوم لے سکتے ہیں، چنانچہ انہوں ابتدا میں ہی ایسے لوگوں کو تنبیہ کرتے ہوئے ان کی بات کا غلط مفہوم اخذ کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا، فرمایا: "أما بعد، فإني قائل لكم مقالة قد قدر لي أن أقولها، لا أدري لعلها بين يدي أجلي، فمن عقلها ووعاها فليحدث بها حيث انتهت به راحلته، ومن خشي أن لا يعقلها فلا أحل لأحد أن يكذب علي"۔ (حمد وثنا کے بعد: لوگو! میں تمہیں ایک بات بتانے جارہا ہوں جسے تم تک پہنچانا میرے اوپر طے تھا، بہت ممکن ہے کہ یہ میری وفات سے قبل کا الوداعی خطبہ ہو، لہذا جس شخص نے اسے درست طریقے سے سمجھ کر اچھے سے یاد کرے وہ جہاں تک ممکن ہو سکے وہاں تک پہنچادے، اور جسے یہ خوف ہو کہ اسے میری باتیں سمجھ میں نہیں آئیں اس کے لئے میرے اوپر جھوٹ بولنا جائز نہیں۔)[1]

2 - حضرت عمرؓ نے اپنے اس خطبے میں بیعت ابو بکر کو "فلتہ" (اچانک واقع ہونے والی بیعت) کہنے والوں کی تردید کی ہے، اور یہ پیغام دیا ہے کہ ان کی بیعت کو "شر" والی بیعت کہنا غلط ہے، چنانچہ فرمایا: " وَإِنَّمَا كَانَتْ فَلْتَةً ، وَلَكِنَّ اللَّهَ وَقَى شَرَّهَا". (بے شک ابو بکرؓ کی بیعت بہت جلدی میں ہوئی تھی مگر اللہ رب العالمین نے ہمیں جلد بازی کے شر سے محفوظ رکھا۔)

3 - حضرت ابو بکرؓ کی جلد بازی میں واقع ہونے والی بیعت اس لئے درست تھی کیوں کہ ان کے مثل کوئی دوسرا نہیں تھا، ان کی فضیلت پوری امت کے نزدیک مسلم تھی، اس لئے پوری امت ان پر متفق بھی ہو گئی۔

---

[1] صحیح البخاری (۶۸۳۰).

جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان سے واضح ہوتا ہے: "وليس منكم من تقطع الأعناق إليه مثل أبي بكر". (اور تمہارے درمیان کوئی بھی ایسا نہیں جو فضیلت میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کے قریب بھی ہو۔)[1]

4 - حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بیعت کو مسلمانوں کے اجتماع اور ان کی خیر و بھلائی کا سبب بتایا، چنانچہ فرماتے ہیں: "وَقَدْ جَمَعَ اللَّهُ أَمْرَ الْمُسْلِمِينَ بِأَبِي بَكْرٍ". (اللہ رب العالمین نے مسلمانوں کو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ذریعے اجتماعیت نصیب فرمایا۔)[2]

---

[1] صحیح البخاری (۶۸۳۰).

[2] مصنف ابن أبی شیبۃ ط السلفیۃ بالہند: (۳۷۰۴۳).

أبو المدیح بلال الخلیلی
جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ

دعوتی امور میں اہل بدعت کے ساتھ شراکت اور منہج موازنات کا جائزہ (قسط دوم)

پہلی قسط میں نکات کی شکل میں بدعت واہل بدعت کے حوالہ سے چند اہم اصول و قواعد ذکر کئے گئے تھے، اب اصل موضوع کے پہلے حصہ پر گفتگو کرتے ہیں کہ اہل بدعت کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور ان کی مجالست کا شرعا کیا حکم ہے، کیونکہ اصل موضوع (منہج موازنات) کی حقیقت اسی پہلے حصہ سے جڑی ہوئی ہے جس میں عدم واقفیت کی بناء پر اکثر لوگ بھٹک گئے ہیں، بلکہ بعض لوگ تو یہ بھی دعوی کرتے ہیں کہ ھجر المبتدعہ پر نہ قرآن سے کچھ ثابت ہے اور نہ حدیث سے، اور جو سلف سے آثار مروی ہیں وہ تمام تشدد پر مبنی اور عدم حجت ہیں، تو آئیں جانتے ہیں کہ ان کے اس دعوی میں کتنی سچائی ہے!!!

قارئین کرام! بدعت اور بدعتی کی دین میں کافی مذمت کی گئی ہے، جس پر کئی آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ اور آثار سلف مروی ہیں، چنانچہ ہجر المبتدعہ یعنی بدعتیوں سے دور رہنا یہ کسی خاص طبقہ کی عملی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ بعض سہولت کاروں نے سمجھ رکھا ہے بلکہ یہ ایک مذہبی حکم، اسلامی فریضہ اور اہم مقصد شرعی ہے جس کو ماننا اور عمل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے، نیز اس مسئلہ میں متعدد علماء سلف نے اجماع بھی نقل کیا ہے، ھجر المبتدعہ کے مسئلہ پر اجماع کے سلسلہ میں قارئین کرام دکتور خالد بن ضحوی القاسمی الظفیری حفظہ اللہ کی کتاب "إجماع العلماء على الهجر والتحذير من أهل الأهواء" پڑھ سکتے ہیں جس میں فاضل مصنف نے دوسری صدی سے پندرہویں صدی ہجری تک کے علماء سنت وسلف صالحین کے ان اقوال کو جمع کر دیا ہے جنہوں نے اس مسئلہ پر تصریحا یا تلمیحا اجماع کا حکم لگایا ہے، جس میں امام اوزاعی، امام فضیل بن عیاض، امام ابو عبید قاسم بن سلّام، امام احمد بن حنبل، امام مزنی، امام ابو زرعہ رازی وابو حاتم رازی، امام ابو بکر آجری، امام ابن بطہ، امام صابونی، قاضی ابو یعلی، امام ابن عبد البر، امام سمعانی، امام بغوی، امام ابن قدامہ المقدسی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، شیخ الاسلام ابن قیم، علامہ

ابن مفلح، امام شاطبی، شیخ الاسلام محمد بن عبد الوھاب، ائمہ آل الشیخ، شیخ حمود بن عبد اللہ التویجری وغیرہم رحمہم اللہ جمیعا شامل ہیں۔

ہجر المبتدع کی مشروعیت کے قرآنی دلائل:

(۱)-﴿وَقَدۡ نَزَّلَ عَلَيۡكُمۡ فِي ٱلۡكِتَٰبِ أَنۡ إِذَا سَمِعۡتُمۡ ءَايَٰتِ ٱللَّهِ يُكۡفَرُ بِهَا وَيُسۡتَهۡزَأُ بِهَا فَلَا تَقۡعُدُواْ مَعَهُمۡ حَتَّىٰ يَخُوضُواْ فِي حَدِيثٍ غَيۡرِهِۦٓ إِنَّكُمۡ إِذٗا مِّثۡلُهُمۡۗ إِنَّ ٱللَّهَ جَامِعُ ٱلۡمُنَٰفِقِينَ وَٱلۡكَٰفِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا﴾-

"اور اللہ رب العالمین تمہارے پاس اپنی کتاب میں یہ حکم اتار چکا ہے کہ تم جب کسی مجلس والوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے اور مذاق اڑاتے ہوئے سنو تو اس مجمع و مجلس میں ان کے ساتھ نہ بیٹھو! جب تک کہ وہ اس کے علاوہ اور باتیں نہ کرنے لگیں، ورنہ تم بھی اس وقت انہی جیسے ہو، یقیناً اللہ تعالیٰ تمام کافروں اور سب منافقین کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے"۔(۱)

آیت کی تفسیر میں سلف کے اقوال:

اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: "اس آیت کی رو سے ہر بدعتی اور دین میں نئے امور ایجاد کرنے والے کے ساتھ قیامت تک کے لئے بیٹھنے کی ممانعت ہے"۔(۲)

شیخ المفسرین ابن جریر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ: "یہ آیت اہل باطل، مبتدعین اور فساق کی ہمنشینی کی ممانعت پر واضح دال ہے"۔(۳)

امام قرطبی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "اس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب گنہگاروں سے کوئی گناہ ظاہر ہو تو ان سے دور رہنا واجب ہے، کیونکہ جو ان سے دور نہیں رہتا وہ گویا کہ ان کے فعل پر راضی ہوتا ہے، اور

---

(۱)(النساء: ۱۴۰)۔

(۲)(تفسیر بغوی: ۱/۷۱۴)۔

(۳)(تفسیر طبری: ۹/۳۲۱)۔

کفر پر راضی ہونا کفر ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: {إِنَّكُم إِذاً مِّثلُهُم} -(بیشک تم بھی ان جیسے ہو)، پس جو کوئی گناہ کی مجلس میں بیٹھے اور ان پر انکار نہ کرے، تو وہ ان کے گناہ میں برابر کا شریک ہوتا ہے، لہذا جب وہ گناہ کی بات کریں یا اس پر عمل کریں تو ان پر انکار کرنا ضروری ہے، اور اگر کوئی شخص ان پر انکار کرنے کی طاقت نہ ہو تو ان کے پاس سے اٹھ جانا چاہیے تاکہ وہ اس آیت کے اہل میں شمار نہ ہو، لہذا جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ گناہگاروں سے دوری برتنا چاہئے، تو بدعتیوں اور خواہشات کے پیروکاروں سے بچنا بدرجہ اولی ضروری ہے"۔(۱)

شیخ عبد الرحمن بن ناصر السعدي رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں بیان فرماتے ہیں کہ: "اس آیت میں ہر قسم کے بدعتی بھی داخل ہیں کیونکہ ان کا اپنے باطل نظریات کے لئے استدلال کرنا اللہ تعالیٰ کی آیات کی اہانت کو متضمن ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات حق کے سوا کسی چیز پر دلالت نہیں کرتیں اور صدق کے سوا کسی چیز کو مستلزم نہیں۔ اس بحث کا حاصل یہی ہے کہ جو کوئی کسی ایسی مجلس میں موجود ہو جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جارہی ہو تو قدرت رکھتے ہوئے اس نافرمانی پر نکیر کرنا اور اس سے روکنا واجب ہے۔ اگر روکنے کی قدرت نہ ہو تو اس مجلس سے اٹھ کر چلا جانا ضروری ہے"۔(۲)

(۲) {وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ}۔(۳)

"اور جب آپ ان لوگوں کو دیکھیں جو ہماری آیات میں عیب جوئی کر رہے ہیں تو ان لوگوں سے کنارہ کش ہو جائیں یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں اور اگر آپ کو شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد پھر ایسے ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھیں".

---

(۱)(تفسیر القرطبی: ۴۱۸/۵)۔

(۲)(تفسیر سعدی بتصرف یسیر: ۲۱۰)۔

(۳)(الأنعام:۶۸)۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "اس آیت میں ان لوگوں کے لیے ایک بہت بڑا سبق ہے جو بدعتیوں کے ساتھ بیٹھنے کو جائز سمجھتے ہیں، وہ لوگ جو کلام اللہ (کے مفہوم) کو بدل (کر بیان) دیتے ہیں، اس کی کتاب اور جو قرآن وسنت کے (نصوص کے) ساتھ کھلواڑ کرتے ہیں، اور ان (نصوص) کو اپنی گمراہ خواہشات اور فاسد بدعات کے مطابق بیان کرتے ہیں۔ اگر کوئی ان کی مذمت نہیں کرتا اور ان کو بدلنے کی طاقت نہیں رکھتا تو کم از کم ایسے لوگوں کو ان (بدعتیوں) کی مجلس چھوڑ دینی چاہیے، اور یہ ان (مؤمنین) کیلئے آسان ہے کوئی مشکل کام نہیں، اور (اگر آپ ان کی مجلس میں شریک ہوتے ہیں تو) ممکن ہے کہ وہ (بدعتی) لوگ آپ کی ان کے ساتھ موجودگی کو، اس بات کے ساتھ کہ آپ ان کے گناہوں میں شریک نہیں ہیں، ایک شبہ یا دلیل بنا سکتے ہیں جس سے وہ عام لوگوں کو گمراہ کر سکتے ہیں، اس لیے آپ کی موجودگی صرف گناہ سننے کے نقصان کے علاوہ ایک اضافی فساد کا باعث بن سکتی ہے، اور ہم نے اس طرح کی لعنت زدہ کئی مجالس کا معائنہ کیا ہے جن کا کوئی شمار نہیں۔ ہم نے حمایت حق اور دفع باطل کیلئے حتی المقدور کوشش کی ہے، اور جس نے اس شریعت مطہرہ کو صحیح طور پر جان لیا وہ بالیقین جانتا ہے کہ مبتدعہ کی مجلس میں بیٹھنا، گناہ کرنے والوں کی مجلس میں بیٹھنے سے کہیں زیادہ نقصان دہ ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو کتاب وسنت کے علم میں پختہ نہیں ہیں، کیونکہ ان پر ان کی جھوٹی باتوں اور بے تکی باتوں میں سے کچھ ایسی باتیں بھی ٹھیک لگ سکتی ہیں جو کہ واضح طور پر باطل ہیں، اور یہ ان کے دل میں ایسے بیج بو سکتے ہیں جن کا علاج کرنا مشکل اور جنہیں دور کرنا محال ہو، اور پھر وہ اس بدعت پر اپنی پوری زندگی عمل کرتے رہیں اور اسی حال میں اس کی وفات ہو جائے، جبکہ وہ شریعت کی نظر میں عمل مردود تھا"۔ (۱)

(۳) {وَلَا تَرْكَنُوٓا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ}۔ (۲)

"دیکھو ظالموں کی طرف ہرگز نہیں جھکنا ورنہ تمہیں بھی (دوزخ کی) آگ لگ جائے گی اور اللہ کے سوا اور تمہارا مددگار نہ کھڑا ہو سکے گا اور نہ تم مدد دیئے جاؤ گے"۔

---

(۱) (فتح القدیر للشوکانی: ۱/۶۰۷)۔

(۲) (ہود: ۱۱۳)۔

اس آیت کی تفسیر میں امام قرطبی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: "اور یہ آیت کفار، گناہگاروں اور بدعتیوں سے دوری اختیار کرنے پر دلالت کرتی ہے، تو ایسی صورت ان (اہل کفر و مبتدعہ) کی صحبت یا تو کفریہ ہوگی یا معصیت پر مبنی، کیونکہ کسی کی بھی صحبت و مجالست ان سے محبت کی بناء پر ہی ہوتی ہے"۔ (۱)

(۴) {وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَه وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَه عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُه فُرُطًا}۔ (۲)

"اور اپنے آپ کو انھیں کے ساتھ رکھا کرو جو اپنے پروردگار کو صبح شام پکارتے ہیں اور اسی کے چہرے کے ارادے رکھتے ہیں (رضامندی چاہتے ہیں)، خبردار! تمہاری نگاہیں ان سے نہ ہٹنی پائیں کہ دنیاوی زندگی کے ٹھاٹھ کے ارادے میں لگ جاؤ، دیکھو اس کا کہنا نہ ماننا جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہش کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور جس کا کام حد سے گزر چکا ہے"۔

امام سعدی رحمہ کہتے ہیں کہ: ﴿وَاتَّبَعَ هَوَاهُ﴾ اور وہ اپنی خواہشات نفس کے پیچھے لگ گیا" اس کے نفس نے جو چاہا وہ کیا اور اس کو پا لینے کی کوشش کرنے لگا خواہ اس میں اس کی ہلاکت اور اس کے لیے خسارہ ہی کیوں نہ ہو۔ پس اس نے اپنی خواہشات نفس کو اپنا معبود بنا لیا جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ﴾ (۳) "کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا لیا اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہ کر دیا۔" ﴿وَكَانَ أَمْرُهُ﴾ "اور اس کا کام ہے" یعنی اس کے دین و دنیا کے مصالح ﴿فُرُطًا﴾ "حد سے نکل جانا" یعنی ضائع اور معطل ہونے

---

(۱) (تفسیر قرطبی: ۱۰۸/۹)۔

(۲) (الکہف: ۲۸)۔

(۳) (الجاثیۃ: ۲۳/۴۵)۔

والے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کی بات سننے سے روکا ہے کیونکہ اس کی اطاعت اس کی پیروی کرنے کی دعوت دیتی ہے، نیز اس لیے کہ وہ صرف اسی چیز کی طرف دعوت دیتا ہے جس سے وہ خود متصف ہے۔ (۱)

اور اس کے علاوہ کئی آیتیں ہیں جن میں اللہ رب العالمین نے اہل اہواء، مبتدعہ اور کفار سے اعراض کرنے کا حکم دیا ہے۔

(۱) (تفسیر السعدی: ۴۷۵)۔

عبد العزیز یوسف
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

لفظ "منہج" پر اعتراض اور اس کے جوابات(۱) (قسط سوم)

نجات کا دارومدار اپنی جماعت وجمعیت کا کوئی خاص نام رکھ لینے پر نہیں بلکہ قرآن وسنت پر عمل کرنے پر ہے۔ عاملین کتاب وسنت مختلف زبانوں اور علاقوں میں مختلف ناموں سے مشہور ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ الگ الگ فرقے بن گئے ہیں بلکہ وہ سب تنظیمیں یا جماعتیں "الجماعة" اور "ما أنا عليه اليوم وأصحابي" میں شامل ہیں۔ ارشادی باری تعالی ہے: ﴿وَإِنَّ هَٰذِهِۦٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَٰحِدَةً وَأَنَا۠ رَبُّكُمْ فَٱتَّقُونِ ﴿٥٢﴾ فَتَقَطَّعُوٓا۟ أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۖ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴿٥٣﴾﴾۔(۲) "یقیناً تمہارا یہ دین ایک ہی دین ہے اور میں ہی تم سب کا رب ہوں، پس تم مجھ سے ڈرتے رہو۔ لیکن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے آپس میں ایک دوسرے سے کٹ کر مختلف ومتفرق ملتوں میں بٹ گئے، اور ہر کوئی گروہ اپنے دین میں مست ومگن ہے، اسی پر خوش ہے اور اترا رہا ہے"۔

امام قرطبی رحمہ اللہ مذکورہ دونوں آیتوں کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "هَذِهِ الْآيَةُ تَنْظُرُ إِلَى قَوْلِهِ ﷺ [فذكر الحديث السابق] ثم قال: وَهَذَا يُبَيِّنُ أَنَّ الِافْتِرَاقَ الْمُحَذَّرَ مِنْهُ فِي الْآيَةِ وَالْحَدِيثِ إِنَّمَا هُوَ فِي أُصُولِ الدِّينِ وَقَوَاعِدِهِ، لِأَنَّهُ قَدْ أَطْلَقَ عَلَيْهَا مِلَلًا، وَأَخْبَرَ أَنَّ التَّمَسُّكَ بِشَيْءٍ مِنْ تِلْكَ الْمِلَلِ مُوجِبٌ لِدُخُولِ النَّارِ. وَمِثْلُ هَذَا لَا يُقَالُ فِي الْفُرُوعِ، فَإِنَّهُ لَا يُوجِبُ تَعْدِيدَ الْمِلَلِ وَلَا عَذَابَ النَّارِ، قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: لِكُلٍّ جَعَلْنا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهاجًا..."۔

یہ (دوسری والی) آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی (مذکورہ عبد اللہ بن عمرو سے مروی) حدیث کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت اور حدیث دونوں میں جس افتراق سے تحذیر مقصود ہے وہ ہے دین کے اصول وقواعد کی

---

(۱) مذکورہ اعتراض صوبہ مغربی بنگال کے بنگلہ زبان کے معروف ومشہور مقرر نے کیا ہے جو اہل حدیث کے جلسوں اور محفلوں میں شریک ہوتے رہتے ہیں، یہ خود کو بظاہر اہل حدیث باور کراتے ہیں لیکن حقیقت میں سلفی منہج کا مذاق اڑاتے ہیں، شکوک وشبہات پیدا کر کے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور ہمارے مابین رہ کر ہمیں ہی نقصان پہنچاتے ہیں۔ یہ شخص ایک خاص گروپ کی طرف انتساب رکھتے ہیں جس کے بہت سارے شذوذ وتفردات اور سلفی منہج کے کئی اہم اصول وضوابط پر اس کے شبہات ہیں۔

(۲) [المؤمنون ۵۲-۵۳]۔

بنیاد پر تفرقہ بازی کرنا؛ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (۷۲ فرقوں) پر لفظ ملل کا اطلاق کیا ہے اور اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان میں کسی ایک کو اپنانا دخول جہنم کا باعث وسبب ہے، اور اس طرح کی بات دین کے فروعی مسائل کے بارے میں نہیں کہی جاتی ہے؛ کیونکہ ان (میں اختلاف کرنے) سے تعدد ملت لازم نہیں آتا اور نہ ہی دخول جہنم، اللہ تعالی کا فرمان ہے:" لِكُلٍّ جَعَلْنا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهاجًا" ہم نے ہر امت کے لئے شریعت اور طریقت (یعنی دستور وراہ عمل) مقرر کیا ہے"۔

شریعت اگرچہ ہر امت کی الگ الگ ہے لیکن ان سب کا دین ایک ہی ہے وہ ہے اسلام، اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿إِنَّ ٱلدِّينَ عِندَ ٱللَّهِ ٱلْإِسْلَٰمُ﴾۔(۱)"بے شک اللہ کے نزدیک دین برحق صرف اور صرف اسلام ہے"۔ اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:"والأنبياءُ إخوةٌ لِعَلّاتٍ؛ أُمَّهاتُهم شَتّى، ودِينُهم واحِدٌ". "انبیاء آپس میں علاتی بھائی کی طرح ہیں، ان کی مائیں مختلف ہیں لیکن ان دین ایک"۔(۲) یعنی ان سب کی شریعت اگرچہ مختلف ہو لیکن سب کے سب اصول دین، عقیدہ وتوحید اور مقاصد شرعیہ میں متفق ہیں۔ لہذا سابقہ امتوں میں سے وہی لوگ جنت کے مستحق ہوئے جنکے اصول دین اور عقائد ومنہج درست تھے۔

معلوم ہوا کہ اس تفرقہ سے مراد وہ اصولی اختلافات ہیں جو توحید، تقدیر، شروط نبوت ورسالت، محبت حدیث اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ محبت وموالاۃ وغیرہ کے مسائل میں ظاہر ہوئے اور ان مسائل میں ایک دوسرے کی تکفیر کی گئی جبکہ فروعی اور خاص کرکے فقہی نوعیت کے مسائل میں کسی نے کسی کو کافر نہیں کہا، نیز اللہ تعالی کے اس فرمان: -

﴿إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾(۳)"بے شک جنہوں نے اپنے دین میں اختلاف وتفرقہ پیدا کیا، اور کئی فرقوں اور جماعتوں میں بٹ گئے، آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں، ان کا معاملہ تو اللہ کے یہاں سپرد ہے، پھر انہیں ان کے کئے ہوئے کاموں کے بارے میں بتلائے گا" - سے بھی معلوم

---

(۱)[آل عمران۱۹]۔

(۲) صحیح البخاری(۳۴۴۳)۔

(۳)(الأنعام، آیت:۱۵۹)۔

ہوتا ہے کہ تفرقہ بازی اسوقت مذموم ہے جب اس کی بنیاد اصول دین پر ہو نہ کہ فروعی مسائل میں اختلاف کرنا موجب افتراق ہے، اس بات کی وضاحت "شِيَعًا" کی تفسیر اہل بدعت کرنے سے بھی ہوتی ہے، جیسا کہ ابو ہریرہ اور دیگر صحابہ سے روایت ہے کہ ان سے مراد اہل بدعت ہیں۔ امام ابن جریر اور حافظ ابن کثیر رحمہما اللہ نے بھی آیت کے عمومی معنی سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ آیت عام ہے اور ہر اس شخص کو شامل ہے جس نے دین میں تفرقہ بازی کی اور مختلف فرقوں و گروہوں میں بٹ گئے۔ (۱)

ان چار نکات کے بعد یہ بات بالکل روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ موصوف صاحب کا کہنا کہ "منہج سلف" عصر حاضر کی پیداوار ہے اس کا کوئی اصل نہیں ہے یہ ایک باطل اور فاسد قول ہے جو کہ جہالت اور ظلم وزیادتی پر مبنی ہے، اور یہ یقین جانیں کہ جہالت و ظلم یہی دونوں ہر برائی کی اصل جڑ ہے، اسی لئے آپ اس منہج پر اعتراض کرنے والوں کو فتنہ پرور پائیں گے جو صرف اور صرف دنیا میں فساد برپا کرتے ہیں۔

پانچواں نکتہ:

موصوف صاحب کہتے ہیں کہ "اس منہج کے بغیر ہی ہمارا دین وایمان صحیح سالم تھا، ابھی بھی ہے، اور آئندہ بھی رہے گا"۔

کوئی بھی شخص اگر منہج سلف کے تعلق سے تھوڑی بہت شد بد رکھتا ہو وہ کبھی بھی اس طرح کی بے تکی باتیں نہیں کر سکتا الا یہ ہے کہ وہ ہٹ دھرم، ضدی اور ہوی پرست ہو، مجھے تعجب ہے کہ بھلا موصوف صاحب اس طرح کی باتیں کہنے کی ہمت کیسے کی؟ جب کہ اللہ کا فرمان ہے: ﴿فَإِنۡ ءَامَنُواْ بِمِثۡلِ مَآ ءَامَنتُم بِهِۦ فَقَدِ ٱهۡتَدَواْۖ وَّإِن تَوَلَّوۡاْ فَإِنَّمَا هُمۡ فِي شِقَاقٖۖ فَسَيَكۡفِيكَهُمُ ٱللَّهُۚ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلۡعَلِيمُ﴾۔ (۲) "اگر یہ لوگ اسی طرح ایمان لائے جس طرح تم (صحابہ کرام) ایمان لائے، تو یقینا وہ ہدایت یافتہ ہو جائیں گے، اور اگر انہوں نے حق سے منہ پھیر لیا اور روگردانی کی تو بلا شبہ وہ صریح مخالفت اور ہٹ دھرمی کے شکار ہوں گے، اللہ ان کے مقابلے میں آپ کے لئے کافی ہے، وہ خوب سننے اور جاننے والا ہے"۔

---

(۱) تفسیر ابن جریر (۱۰/۳۳-۳۴)، تفسیر ابن کثیر (۲۴۰/۶) اسی طرح دیکھئے موسوعۃ التفسیر بالماثور ۲۹۵/۶۔

(۲)[البقرۃ ۱۳۷]۔

اگر ہمارا ایمان لانے کا طریقہ صحابہ کے طریقے پر نہ ہو تو وہ ایمان قابل قبول نہیں ہے! رشد وہدایت اور نجات پانے کے لئے شرط ہے کہ ہم اسی طرح راہ ہدایت پر چلیں جس طرح صحابہ کرام چلے تھے ورنہ آیت کا مفہوم واضح ہے کہ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو یہ گمراہی کا سبب بن جائے گا، اور یہی سچائی ہے؛ آپ پوری تاریخ اسلام کا مطالعہ کرلیں شروع سے لیکر آج تک جنہوں نے بھی صحابہ کے منہج کو ٹھکرایا وہ لوگ یقیناً گمراہ ٹھہرے!

عہد رسالت میں کفار ومشرکین، یہود ونصاری، اسی طرح منافقین کی یہی حالت تھی، اور بعد کے زمانے میں ہر وہ فرقہ کی جو اہل السنہ والجماعہ کے اصول وقواعد پر قائم نہیں تھے وہ سب کے سب بلا استثناء صحابہ کے طریقے سے اعراض کئے اور گمراہی میں مبتلا ہوگئے۔ منافقین نے تو برملا کہہ دیا جسے اللہ نے قرآن میں بیان کیا: ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ ءَامِنُواْ كَمَآ ءَامَنَ ٱلنَّاسُ قَالُوٓاْ أَنُؤْمِنُ كَمَآ ءَامَنَ ٱلسُّفَهَآءُۗ أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ ٱلسُّفَهَآءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ﴾۔ (۱) "جب ان (منافقین) سے کہا جاتا کہ تم لوگ اسی طرح ایمان لاؤ جس طرح صحابہ نے ایمان لایا تو وہ کہتے کہ کیا ہم ان بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں؟ بے شک وہ خود ہی بے وقوف ہیں (اور صحابہ کرام ہی اصل میں عقل مند اور دانشور ہیں) لیکن یہ لوگ جانتے نہیں"۔

صحابہ کرام کا ایمان ایک معیار وکسوٹی ہے جس پر باقی امت کے ایمان کو پرکھا جائے گا، ان کے منہج کے مخالف کوئی بھی عقیدہ یا قول وعمل ہو اور بظاہر کتنا بھی خوبصورت وحسین ہو وہ گمراہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی اہل حق حق کی طرف دعوت دیتے ہیں تو انہیں مخالفین کی طرف سے ہمیشہ ایک ہی رویہ دیکھنے کو ملتا ہے وہ ہے گالیاں دینا، برا بھلا کہنا، کبھی تو انہیں حماقت وجہالت سے منسوب کرنا اور کبھی تو فحش گوئی کے ساتھ انہیں برے القاب سے نوازنا۔

عربی کا ایک مقولہ ہے: "السب والشتم سلاح کل عاجز وضعیف" ہر عاجز اور کمزور کا آخری حیلہ طعن وتشنیع ہوا کرتا ہے، جب کوئی ادلہ وبراہین اور حجتیں پیش کرنے سے عاجز آجاتا ہے تو وہ بدزبانی پر اتر آتا ہے۔

موصوف صاحب کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے اپنے دین وایمان کو صحیح سالم رکھنے اور اسے اللہ کے نزدیک مقبول کرانے کے لئے جس طرح منہج سلف کی اتباع فرض ہے اسی طرح اللہ کی رضا وخوشنودی، اس کی جنت اور دنیا وآخرت میں سعادت

---

(۱)[البقرۃ ۱۳]۔

حاصل کرنے کے لئے اس منہج کی اتباع بھی لازم ہے۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے:﴿وَٱلسَّٰبِقُونَ ٱلۡأَوَّلُونَ مِنَ ٱلۡمُهَٰجِرِينَ وَٱلۡأَنصَارِ وَٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُم بِإِحۡسَٰنٖ رَّضِيَ ٱللَّهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُواْ عَنۡهُ وَأَعَدَّ لَهُمۡ جَنَّٰتٖ تَجۡرِي تَحۡتَهَا ٱلۡأَنۡهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدٗاۚ ذَٰلِكَ ٱلۡفَوۡزُ ٱلۡعَظِيمُ﴾۔ (۱) "اور مہاجرین وانصار میں سے جنہوں نے سبقت کی اور جنہوں نے اخلاص وسچائی کے ساتھ ان کی اتباع وپیروی کی اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ بھی اللہ سے راضی ہو گئے، اللہ نے ان کے لئے ایسی جنتیں تیار کی ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، ان میں ہمیشہ ہمیش کے لئے رہیں گے، یہی سب سے عظیم کامیابی ہے" یہ آیت صرف قرون ثلاثہ مفضلہ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ قیامت تک آنے والے سارے مسلمانوں کو شامل ہے جنہوں نے صحابہ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔

عصمہ رحمہ اللہ سے روایت ہے انہوں نے سفیان ثوری سے تابعین کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا: "هم الذين أدركوا أصحابَ النبيِّ ﷺ، ولم يُدرِكوا النبيَّ ﷺ" "یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے صحابہ سے ملاقات کی نہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عصمہ فرماتے ہیں کہ میں نے سوال کیا: اخلاص کے ساتھ ان کے نقش قدم پر چلنے والے کون لوگ ہیں؟ انہوں نے فرمایا: "مَن يجيء بعدَهم" "جو بھی ان کے بعد آئیں گے"۔

عصمہ کہتے ہیں کہ میں نے پھر پوچھا: کیا قیامت تک آنے والے ہر مسلم کو شامل ہے؟ سفیان ثوری فرماتے ہیں: "أرجُو" "میں یہی امید کرتا ہوں" (۲)

اسی طرح عبد الرحمن بن زید بن اسلم سے یہ تفسیر منقول ہے کہ: "مَن بقي مِن أهل الإسلام إلى أن تقوم الساعة". "صحابہ کے بعد باقی جتنے بھی مسلمان قیامت تک آنے والے ہیں سب اس آیت میں شامل ہیں"۔ (۳)

---

(۱)[التوبۃ:۱۰۰]

(۲)الدر المنثور" از: السیوطی ۴/۲۷۲

(۳)تفسیر ابن أبی حاتم: ۱۸۶۹/۶.

ابن القیم اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:«فهؤلاء هم السعداء الذين ثبت لهم رِضا اللهِ عنهم، وهم أصحاب رسول الله ﷺ، وكلُّ مَن تبعهم بإحسان إلى يوم القيامة، ولا يختصُّ ذلك بالقرن الذين رأوهم فقط، وإنّما خَصَّ التابعين بمَن رأوا الصحابةَ تخصيصا عُرفيًّا لِيَتَمَيَّزوا به عمَّن بعدهم؛ فقيل: التابعون مطلقًا لذلك القرن فقط، وإلا فكُلُّ مَن سلك سبيلهم فهو من التابعين لهم بإحسان، وهو مِمَّن رضي الله عنهم ورضوا عنه». "حقیقت میں یہی لوگ خوش نصیب ہیں، جن کے لئے اللہ کی رضاوخوشنودی متحقق ہوگئی،یعنی صحابہ کرام اور ان کے بعد قیامت تک آنے والے لوگ جو اخلاص وراست بازی کے ساتھ ان کی اتباع وپیروی کی، اور یہ صرف اس جماعت کے ساتھ خاص نہیں جنہوں نے صحابہ کو دیکھا ہے، اگرچہ تابعین کا ذکر عرفًا خصوصی طور پر اس لئے کیا گیا تاکہ وہ بعد کے لوگوں سے ممتاز ہو سکیں، اسلئے انہیں مطلقا تابعین کا لقب دیا گیا ورنہ ہر وہ شخص جس نے صحابہ کرام کا طریقہ اختیار کیا وہ بھی ان کے مخلص پیروکاروں میں شامل ہیں جن سے اللہ بھی راضی ہو گیا اور وہ بھی اللہ سے راضی ہو گئے"۔(۱)

چھٹا نکتہ:

موصوف صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس منہج کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ضرورت نہیں ہے تو وہ قرآن وسنت کے نصوص کی تشریح وتوضیح کیسے کریں گے؟ اپنی عقل وفہم کی بنیاد پر؟ یا صرف لغت کا اعتبار کرتے ہوئے ان کی شرح کریں گے؟ حالانکہ ہر انسان کی عقل مختلف ہے اور لغت میں ایک لفظ کے کئی کئی معانی ہوا کرتے ہیں!

آپ ان نصوص کی تشریح کیسے کریں گے جن کے سلسلے میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی مرفوع قولی یا فعلی یا تقریری حدیث موجود نہ ہو!؟ جیسے: صوفیاء اور مجاورین اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا مانگنا جائز ہے: ﴿وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذۡنِ ٱللَّهِۚ وَلَوۡ أَنَّهُمۡ إِذ ظَّلَمُوٓاْ أَنفُسَهُمۡ جَآءُوكَ فَٱسۡتَغۡفَرُواْ ٱللَّهَ وَٱسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ ٱلرَّسُولُ لَوَجَدُواْ ٱللَّهَ تَوَّابٗا رَّحِيمٗا﴾۔(۲)

---

(۱)"الرسالة التبوكية" از: ابن القیم ص:۶۰۔

(۲)[النساء ۶۴]۔

" اور (انہیں بتلایئے کہ) ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے، اس لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے اور جب انھوں نے اپنے آپ پر ظلم کر لیا تھا، تو اگر وہ اس وقت آپ کے پاس آجاتے اور اللہ سے بخشش طلب کرتے اور رسول بھی ان کے لیے بخشش طلب کرتا تو یقیناً اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا پاتے"۔

آپ کیسے ثابت کریں گے کہ یہ شرک اکبر ہے جس سے آدمی دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور ہمیشہ ہمیش کے لئے جہنم میں داخل ہوتا ہے؟

اس جواب ایک ہی ہے کہ قرآن کی اس آیت سے یہ فہم و مراد آپ کی ہے! نہ کسی صحابی کی ہے اور نہ ہی کسی سلف کی، بلکہ صحابہ کرام اور سلف صالحین اور علماء اہل السنہ والجماعہ کا اجماع ہے کہ یہ آیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ساتھ خاص ہے!

کیا معتزلہ نے خلق قرآن کی اس بدعت کفریہ پر قرآن سے استدلال نہیں کیا؟ انہوں نے دلیل دی: ﴿مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ إِلَّا ٱسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ﴾۔ (۱) "جب بھی ان کے رب کی جانب سے ان کے لیے کوئی نئی نصیحت آتی ہے تو وہ اس حال میں سنتے ہیں کہ وہ کھیل کود رہے ہوتے ہیں۔"

آپ کیا جواب دیں گے؟ لا محالہ یہی کہ صحابہ کرام اور ان کے بعد آنے والے سلف صالحین اور جتنے علماء اہل السنہ والجماعہ ہیں سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ "محدث" سے مراد "جدید" ہے "مخلوق" نہیں۔

بلکہ قرآن کی آیت ﴿وَلَمَّا جَآءَ مُوسَىٰ لِمِيقَٰتِنَا وَكَلَّمَهُۥ رَبُّهُۥ قَالَ رَبِّ أَرِنِيٓ أَنظُرْ إِلَيْكَ ۚ قَالَ لَن تَرَىٰنِي وَلَٰكِنِ ٱنظُرْ إِلَى ٱلْجَبَلِ فَإِنِ ٱسْتَقَرَّ مَكَانَهُۥ فَسَوْفَ تَرَىٰنِي ----﴾ (۲) کے "لن ترانی" ٹکڑے سے انہوں نے سرے سے اللہ کی رویت کا انکار کر دیا ہے۔

---

(۱)[الأنبياء ۲]۔

(۲)[الأعراف ۱۴۳]۔

اسی طرح فلاسفہ نے اللہ کے لئے ہر طرح کے اسماء وصفات کا انکار کیا ہے اور دلیل دی ہے سورہ اخلاص کی پہلی آیت "﴿قُلۡ هُوَ ٱللَّهُ أَحَدٌ﴾۔(۱)

اسی طرح اگر کوئی کہے کہ توبہ کے لئے شرط ہے کہ خودکشی کی جائے اور اس کے جواز کی دلیل قرآن سے دے: ﴿وَإِذۡ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوۡمِهِۦ يَٰقَوۡمِ إِنَّكُمۡ ظَلَمۡتُمۡ أَنفُسَكُم بِٱتِّخَاذِكُمُ ٱلۡعِجۡلَ فَتُوبُوٓاْ إِلَىٰ بَارِئِكُمۡ فَٱقۡتُلُوٓاْ أَنفُسَكُمۡ ذَٰلِكُمۡ خَيۡرٞ لَّكُمۡ عِندَ بَارِئِكُمۡ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ﴾۔(۲) "اور جب موسیٰ نے (واپس آکر) اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے آپ پر بڑا ظلم کیا ہے۔ لہٰذا اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور (توبہ کی صورت یہ ہے کہ تم) اپنی جانوں کو قتل کرو۔ تمہارے رب کے ہاں یہی بات تمہارے حق میں بہتر ہے۔ چنانچہ اللہ نے تمہاری توبہ قبول کرلی۔ کیونکہ وہ توبہ قبول کرنے والا اور نہایت رحم کرنے والا ہے"۔

تو آپ کے لئے کوئی چارہ نہیں سوائے اس کے کہ آپ ان کو جواب دیں کہ صحابہ نے جو تفسیر وتوضیح اور شرح کی ہے وہی ہمارے لئے حجت ہے، ورنہ ہر کوئی اگر اپنی عقل کے مطابق قرآن وسنت سمجھنے لگے تو پھر امت میں اختلاف وافتراق اور فتنہ وفساد کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

صحابہ کرام وسلف صالحین کا منہج اور ان کی فہم ہمارے لئے کیوں ضروری ہے اسے بیان کرتے ہوئے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "يحتاجُ المسلِمونَ إلى شيئينِ: أحدُهما: معرفةُ ما أراد اللهُ ورسولُه صلَّى اللهُ عليه وسلَّم بألفاظِ الكِتابِ والسُّنَّةِ، بأن يَعرِفوا لغةَ القُرآنِ التي بها نزل، وما قاله الصَّحابةُ والتَّابِعونَ لهم بإحسانٍ، وسائِرُ عُلَماءِ المسلمينَ؛ في معاني تلك الألفاظِ؛ فإن الرَّسولَ لَمَّا خاطبَهم بالكِتابِ والسُّنَّةِ عرَّفَهم ما أراد بتلك الألفاظِ، وكانت مَعرِفةُ الصَّحابةِ لمعاني القُرآنِ أكمَلَ من حِفْظِهم لحروفِه، وقد بلَّغوا تلك المعانيَ إلى التَّابعينَ أعظَمَ ممَّا بَلَّغوا حروفَه؛ فإنَّ المعانيَ العامَّةَ التي يحتاجُ إليها عمومُ المسلِمينَ، مثل معنى التَّوحيدِ، ومعنى الواحِدِ، والأحَدِ، والإيمانِ، والإسلامِ، ونحوِ ذلك؛ كان جميعُ الصَّحابةِ يعرفونَ ما أحبَّ اللهُ ورسولُه صلَّى اللهُ عليه وسلَّم من معرفتِه----"۔

---

(۱)[الإخلاص/۱]۔

(۲)[البقرۃ ۵۴]۔

"(دین کے تعلق سے) مسلمانوں کو دو چیزوں کی ضرورت ہے: پہلی چیز: الفاظ قرآن وسنت سے اللہ اور اس کے رسول کی مراد ومقصود کو سمجھنا، اور یہ اس وقت ممکن ہے جب لغت قرآن یعنی عربی زبان کی معرفت حاصل کی جائے جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے، اور معانی قرآن وحدیث سے متعلق جو صحابہ وتابعین کے آثار اور علماء کے اقوال موجود ہیں ان کو مد نظر رکھا جائے۔ (اور صحابہ کے آثار کا علم رکھنا اسلئے ضروری ہے) کیوں کہ اللہ کے رسول نے جب انہیں الفاظ قرآن وسنت کی تعلیم دی تو ساتھ ہی ساتھ ان کے معانی ومفاہیم اور شرعی مراد ومقصود کو بھی بیان کیا، اور صحابہ کرام قرآن کریم کے معانی کو اس کے الفاظ وحروف سے بھی زیادہ ازبر رکھتے تھے، انہوں نے تابعین تک قرآن کے حروف وکلمات سے زیادہ اس کے معانی کو پہنچانے کو کوششیں کی، اور جو مسائل مسلمانوں کو عموما جاننے کی ضرورت ہے جیسے توحید اور اسلام وایمان کے مسائل اسی طرح اسماء وصفات مثال کے طور الواحد اور الاحد کے معانی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس سلسلے میں اللہ اور اس کے رسول کے پسندیدہ علم ومعرفت حاصل کئے ہیں۔۔۔"۔(۱)

ابو الحسن محمد بن أسلم طوسی رحمہ اللہ مندرجہ ذیل دو حدیثوں کو ذکر کرتے ہیں:

پہلی حدیث عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: "خَطَّ لَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ خَطًّا، فَقَالَ: «هَذَا سَبِيلُ اللَّهِ» ثُمَّ خَطَّ خُطُوطًا عَنْ يَمِينِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ ثُمَّ قَالَ: «هَذِهِ سُبُلٌ عَلَى كُلِّ سَبِيلٍ مِنْهَا شَيْطَانٌ يَدْعُو إِلَيْهِ» ثُمَّ قَرَأَ: ﴿وَأَنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذَلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾۔ (۲)

دوسری حدیث عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو کی «إِنَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ افْتَرَقُوا عَلَى اثْنَتَيْنِ وَسَبْعِينَ مِلَّةً وَأُمَّتِي تَفْتَرِقُ عَلَى ثَلَاثَةٍ وَسَبْعِينَ كُلُّهَا فِي النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً» قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، مَنْ هُم ؟ قَالَ: «مَا أَنَا عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَأَصْحَابِي».

---

(۱) "مجموع الفتاوی" از: ابن تیمیہ ۱۷/۳۵۳۔

(۲) [الأنعام: ۱۵۳]۔

پھر ان کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "فَرَجَعَ الْحَدِيثُ إِلَى وَاحِدٍ، وَ"السَّبِيلُ": الَّذِي قَالَ فِي حَدِيثِ ابْنِ مَسْعُودٍ وَالَّذِي قَالَ: «مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي». فَدِينُ اللَّهِ فِي سَبِيلٍ وَاحِدٍ فَكُلُّ عَمَلٍ أَعْمَلُهُ أَعْرِضُهُ عَلَى هَذَيْنِ الْحَدِيثَيْنِ فَمَا وَافَقَهُمَا عَمِلْتُهُ وَمَا خَالَفَهُمَا تَرَكْتُهُ.. "

"معاملہ اخیر میں جاکر ایک ہی امر پر ٹک گیا، وہ یہ ہے کہ ابن مسعود کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس "سبیل" کے بارے میں بیان فرمایا وہ وہی "سبیل" ہے جس کے بارے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن عمرو کی حدیث میں بیان فرمایا: "ما أناعليه وأصحابي"، خلاصہ یہ نکلا کہ اللہ کے دین کا دارومدار اسی "سبیل" (راستے) پر ہے؛ چنانچہ جو کوئی بھی عمل میں کرتا ہوں، میں ان دو حدیثوں کی روشنی میں دیکھتا ہوں، جو ان سے مطابقت رکھتی ہو، میں اُسے کرتا ہوں، اور جو ان سے مخالفت کرتی ہو، میں اُسے چھوڑ دیتا ہوں۔ (۱)

اللہ محمد بن اسلم طوسی کو غریق رحمت فرمائے انہوں نے کتنا ہی عظیم اصول اور قاعدہ ان دو حدیثوں سے مستنبط کیا کہ اگر ہمارا عمل صحابہ کرام کے منہج کے مطابق ہو تو قابل قبول ہے ورنہ وہ مردود ہے۔

ساتواں اور آخری نکتہ:

اس مضمون کا خلاصہ مندرجہ ذیل چند سطور میں بیان کیا جارہا ہے:

۱- اہل السنہ والجماعہ کا یہ طرہ امتیاز رہا ہے کہ وہ الفاظ کے استعمال میں نصوص شرعیہ اور آثار سلفیہ کو مد نظر رکھتے ہیں، جب کہ باطل وگمراہ فرقوں نے یا تو فاسد معانی پر مبنی الفاظ استعمال کیا ہے یا پھر "کلمۃ حق اُرید بھا الباطل" قاعدے کے تحت درست الفاظ کا غلط استعمال کیا ہے، اہل السنہ والجماعہ کے ناموں کو بھی دیکھئے کہ وہ سب نصوص سے ماخوذ جامع ومانع ہیں۔

۲- اگر کوئی شخص اتنی لمبی وتفصیلی بحث کے بعد بھی کلمہ "منہج" پر اعتراض کرے تو آیا وہ مجنون ہوگا جس سے ادراک وفہم کی قوت سلب کرلی گئی ہو یا پھر وہ متکبر ومغرور ہوگا جس کا کوئی علاج نہیں۔

---

(۱) "حلیۃ الأولیاء" از: ابو نعیم ۹/۲۳۸۔

۳- منہج سلف کی اتباع پر اللہ کا مطلق حکم (امر) ہے جو کسی قرینہ کے ساتھ مقید نہیں ہے، اور امر مطلق چار چیزوں پر دلالت کرتا ہے:

أ- کہ وہ واجب ہے۔

ب- اس حکم کو بجالانے سے بندہ کو ثواب حاصل ہوتا ہے اور نہ کرنے سے عذاب کا مستحق قرار پاتا ہے۔

ج- اس سے اس کی ضد یعنی "نهي" کی نفی ہوتی ہے۔

د- فوراً اس پر عمل کرنا ہے تاخیر کی گنجائش نہیں۔

ھ- تکرار واستمرار اور مداومت کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہونا ہے۔ (۱)

اسلئے ایک مسلم پر فرض عین ہے کہ وہ منہج سلف کو زندگی گزارنے کا ایک اہم اصول وضابطہ بنائے۔

۴- منہج سلف کی مخالفت فسق ہے اور مخالف شخص فاسق ہے جیسا کہ دوسرے نکتے میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالی نے منہج سلف کی مخالفت کو رسول کی مخالفت کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے اور دونوں لازم وملزوم ہے، کسی بھی ایک کی مخالفت کرنے والے پر اللہ کی وعید ہے، اور بلاشبہ فسق کی تعریف ہی یہی کہ اللہ کی اطاعت سے خروج کرکے کسی ایسے گناہ میں مبتلا ہونا جس پر اللہ کا وعید ہو چاہے دنیوی یا اخروی!

حافظ ذہبی فرماتے ہیں: "وَالَّذِي يتَّجه وَيقوم عَلَيْهِ الدَّلِيل أَن من ارْتكب شَيْئا من هَذِه العظائم مِمَّا فِيهِ حد فِي الدُّنْيَا كَالْقَتْلِ وَالزِّنَا وَالسَّرِقَة أَو جَاءَ فِيهِ وَعِيد فِي الْآخِرَة من عَذَاب أَو غضب أَو تهديد أَو لعن فَاعله على لِسَان نَبينَا مُحَمَّد ﷺ فَإِنَّهُ كَبِيرَة" ۔

(۱) ان اصولی مباحث کے لئے دیکھئے: جلاء الأفہام ۴۵۹-۴۶۰ أحکام أہل الذمۃ ۵۰۷ زاد المعاد فی ہدی خیر العباد ۳/۳۶۴ تینوں امام ابن القیم کی کتابیں ہیں۔ تفصیلی مطالعہ کے لئے دیکھیں "إرشاد الفحول" از: امام شوکانی: المقصد الرابع: الفصل الأول ۱/۲۴۱.

"جو بات درست اور مدلل معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جو بھی شخص ایسے گناہ کا ارتکاب کرتا ہو جس سے دنیا میں حد لازم آئے جیسے قتل، زنا، چوری یا جس گناہ پر اخروی وعید مترتب ہوتی ہو جیسے جہنم کا عذاب، اللہ کی ناراضگی، یا دھمکی، یا گناہ کرنے والا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بزبانی ملعون قرار پائے تو اس طرح کے گناہ کو کبیرہ گناہ کہتے ہیں"۔ (۱)

اب آپ ذرا سوچئے کہ اگر کوئی یہ سب جان بوجھ کر کہے کہ اس منہج کی ضرورت نہیں وہ کس قدر خطرے میں ہے!!۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ منہج سلف کی مخالفت کی سنگینی کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (وأما التكفير؛ فالصواب أَنَّ من اجتهد من أمة محمد ﷺ وقَصَدَ الحَقَّ فأخطأ لم يكفر؛ بل يغفر له خطؤه، ومَنْ تَبَيَّنَ له ما جاء به الرسول فشاق الرسول من بعد ما تبين له الهدى واتبع غير سبيل المؤمنين فهو كافر، ومن اتبع هواه وقَصَّرَ في طلب الحق وتَكَلَّمَ بلا علم فهو عاصٍ مذنب، ثم قد يكون فاسقًا---). اهـ. (۲)

"جہاں تک تکفیر کا مسئلہ ہے تو اس سلسلے میں جو صحیح رائے ہے وہ یہ کہ امت محمدی میں سے کوئی شخص اگر حق کی تلاشی کی نیت سے اجتہاد کرے اور وہ چوک کر جائے تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی، بلکہ اس کی خطا کو نظر انداز کیا جائے گا، لیکن جس شخص کے سامنے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا حق واضح ہو جائے اور اسے ہدایت کا راستہ نظر آجائے پھر بھی وہ رسول کی مخالفت کرے، صحابہ کرام اور ان کے پیروکاروں کی راہ پر نہ چلے تو وہ کافر ہے، اور جس نے اپنی خواہشات نفس کی پیروی کی، حق تک پہنچنے میں کوتاہی کی اور لاعلمی کی بنیاد پر دینی مسائل پر گفتگو کی تو وہ ایک گنہگار وخطاکار ہے، کبھی فاسق بھی ہو سکتا ہے۔۔۔"۔

لہذا منہج سلف کا انکار جان بوجھ کر کرنا اور اسے ٹھکرانا کفر بھی ہو سکتا ہے!! معاذ اللہ!

بھلا کسی مسلمان کا دین وایمان صحیح سالم کیسے رہے جب کہ وہ ایسے حکم کا انکار کرتا ہو جس کی فرضیت کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فقد ثَبت وجوب اتِّبَاع السّلف رَحْمَة الله عَلَيْهِم بِالْكتاب وَالسّنة وَالْإِجْمَاع وَالْعبْرَة دلّت عَلَيْهِ فَإِن السّلف لَا يخلوا من أَن يَكُونُوا مصيبين أَو مخطئين فَإِن كَانُوا مصيبين وَجب

---

(۱) "الکبائر" از: امام ذہبی ص: ۸۔

(۲) "مجموع الفتاوی" از: ابن تیمیہ ۱۲/۱۸۰۔

اتباعهم لِأَن اتِّبَاع الصَّوَاب وَاجِب وركوب الْخَطَأ فِي الِاعْتِقَاد حرَام وَلِأَنَّهُم إِذا كَانُوا مصيبين كَانُوا على الصِّرَاط الْمُسْتَقيم ومخالفهم مُتبع لسبيل الشَّيْطَان الْهَادِي إِلَى صِرَاط الْجَحِيم وَقد أَمر الله تَعَالَى بِاتِّبَاع سَبيله وصراطه وَنهى عَن اتِّبَاع مَا سواهُ فَقَالَ ﴿وَأَن هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تتبعوا السبل فَتفرق بكم عَن سَبيله ذَلِكُم وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُون﴾۔(۱) وَإِن زعم زاعم أَنهم مخطئون كَانَ قادحا فِي حق الْإِسْلَام كُله لِأَنَّهُ إِن جَازَ أَن يخطئوا فِي هَذَا جَازَ خطؤهم فِي غَيره من الْإِسْلَام كُله .... إلخ

"سلف صالحین کی اتباع کی فرضیت کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہے، بلکہ عقل بھی یہی کہتی ہے؛ اس لئے کہ آیا سلف صالحین حق پر تھے یا پھر غلطی پر یہاں تیسری کوئی صورت نہیں ہے! اگر وہ حق پر تھے تو ان کی اتباع فرض ہے اسلئے کہ حق کی اتباع فرض ہے اور عقیدے میں غلطی کا ارتکاب حرام ہے"۔

ظاہر ہے سلف صالحین کا حق پر رہنا یعنی ان کا صراط مستقیم پر قائم رہنا مراد ہے، اس راستے کی مخالفت گویا شیطان کی پیروی کرنی ہے جو جہنم کے راستے کی طرف لے جاتا ہے۔ اللہ تعالی نے اپنے راستے پر چلنے کا حکم دیا ہے اور دوسری کوئی راہ اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے: ﴿وَأَن هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تتبعوا السبل فَتفرق بكم عَن سَبيله ذَلِكُم وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُون﴾.

اور اگر کوئی یہ (باطل) گمان کرے کہ سلف صالحین (عقیدے کے باب میں) غلطی پر تھے تو اس سے لازم آئے گا کہ وہ اسلام کے سارے ابواب میں حق سے دور تھے، اسلئے کہ اگر (ان کے فاسد گمان کے مطابق) سلف عقیدے کے باب میں غلطی کر سکتے ہیں تو دوسرے أبواب میں بدرجہ اولی غلطی کریں گے۔۔۔"۔(۲)

اسلئے ایک مسلم کے لئے منہج سلف کی اتباع سے عقلًا اور فطرۃً چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔

---

(۱)[الأنعام ۱۵۳]۔

(۲)"ذم التأويل" از: ابن قدامہ ص: ۳۵۔

٥-اگر کوئی شخص دانستہ طور پر اور دلیل کی بنا پر حق واضح ہو جانے کے بعد بھی سلفی منہج کا کوئی بھی ایک اصول یا قاعدہ کا انکار کرے وہ بدعتی اور ہوی پرست ہے، متبع دلیل نہیں، اس کے اندر "بطر الحق" کی صفت پائی جاتی ہے، وہ معاند و متکبر ہے۔

اور سلف کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ حاجت یا ضرورت کے تحت مصالح اور شرعی مقاصد حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو القاب حسنہ سے ملقب کرنا جائز ہے۔

اخیر میں یہی کہنا ہے کہ:

وكل خير في اتباع من سلف

وكل شر في ابتداع من خلف

وتابع السنة ممن سلف

وجانب البدعة ممن خلف

اسلاف کی اتباع میں ہر قسم کا خیر و بھلائی ہے، اور دین میں خلف کی طرف سے ایجاد کردہ بدعات میں ہر طرح کی شر و برائی ہے۔

لہذا جس سنت پر سلف صالحین قائم و دائم تھے اس کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھیں، اور جن بدعات و خرافات کو خلف نے جنم دیا ہے ان سے کوسوں دور رہیں!

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

A PEN WHICH HAS BEEN RAISED TO ASSIST, DEFEND THE PEOPLE OF TRUTH AND REFUTE FALSEHOOD AND ITS PROPONENTS IS THE BEST KIND.

(Imam Ibn Qayyim Rahimahullah: Al-Tibyan Fi Aemanil Qur'aan, Pg: 310)

Issue 8

Bi Monthly

Manhaj E-Salaf MAGAZINE

Edition-2| Issue-8| Dhu al Qiedah 1445| May 2024

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيَأْتِيَنَّ عَلَى أُمَّتِي مَا أَتَى عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتَّى إِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ أَتَى أُمَّهُ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِي أُمَّتِي مَنْ يَصْنَعُ ذَلِكَ وَإِنَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ تَفَرَّقَتْ عَلَى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِينَ مِلَّةً وَتَفْتَرِقُ أُمَّتِي عَلَى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً قَالُوا وَمَنْ هِيَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي. (سنن الترمذي: 2641)

NARRATED 'ABDULLAH BIN 'AMR: THAT THE MESSENGER OF ALLAH (ﷺ) SAID: "WHAT BEFELL THE CHILDREN OF ISRA'IL WILL BEFALL MY UMMAH, STEP BY STEP, SUCH THAT IF THERE WAS ONE WHO HAD INTERCOURSE WITH HIS MOTHER IN THE OPEN, THEN THERE WOULD BE SOMEONE FROM MY UMMAH WHO WOULD DO THAT. INDEED THE CHILDREN OF ISRA'IL SPLIT INTO SEVENTY-TWO SECTS, AND MY UMMAH WILL SPLIT INTO SEVENTY-THREE SECTS. ALL OF THEM ARE IN THE FIRE EXCEPT ONE SECT." HE SAID: "AND WHICH IS IT O MESSENGER OF ALLAH?" HE SAID: "WHAT I AM UPON AND MY COMPANIONS."

www.salafimanhaj.info